ماہنامہ

مظاہر علوم

سہارنپور



دفتر ماہنامہ مظاہر علوم سہارنپور (یوپی)

اس شمارے میں

○ دائرہ کا سرخ نشان آپ کی مدت خریداری ختم ہونے کی علامت ہے، آئندہ کے لیے رقم ارسال فرمائیں۔

☆ شائع شدہ مضامین سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

☆ جواب طلب امور کے لیے لفافہ اور خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

☆ ماہنامہ، انگریزی ماہ کی ۲/تاریخ کو حوالہ ڈاک کردیا جاتا ہے۔ ۱۰/تاریخ تک موصول نہ ہونے پر مطلع فرمائیں۔

نور سحر

نئے تعلیمی سال کے آغاز پر

مدارس دینیہ کے طلبہ سے

عبداللہ خالد قاسمی خیرآبادی

ماہ شوال سے اسلامی مدارس رمضان کی طویل تعطیل کے بعد دوبارہ کھُل چکے ہیں، اکثر مدارس میں داخلوں کی کارروائی مکمل ہوکر تعلیم کا آغاز بھی ہو چکا ہے، بعض امہات المدارس میں طلبہ کی زیادتی کی وجہ امتحانات داخلہ چل رہے ہیں اور عنقریب ان میں بھی تعلیم وتدریس کا سلسلہ جاری ہوجائے گا اور دینی علوم ومعارف کے فیضان میں حضرات اساتذۂ کرام سرگرم عمل ہوجائیں گے۔

دینی علوم اور دینی تعلیم کیا ہے؟ اللہ رب العزت کی جانب سے بھیجے ہوئے قوانین اورانبیاء ورُسل کے ذریعہ، ان کی تلقین وتشریح ہی کا دوسرا نام ’’دینی تعلیم‘‘ ہے۔

علم دین کی اہمیت کے سلسلے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی بہت کافی و شافی ہے: طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِیْضَۃٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ یعنی اتنی دینی تعلیم اور اتنی بصیرت ہر مسلم مرد وعورت کے لیے بے حد ضروری ہے، جن سے وہ دین پر صحیح طور سے عمل پیرا ہوسکیں اور شریعت کے مطالبات کو روبہ عمل لاکر نگاہِ شریعت میں معتبر بن سکیں، پھر خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب بن کر، اپنی عاقبت سدھار کر، زندگی گذار سکیں، جو ایک مسلمان کا نصب العین ہے۔

دینی مدارس میں یہی علم دین سکھایا جاتا ہے اس لئے کہ ہماری دینی درس گاہوں اور مدارس اسلامیہ کا اصل موضوع قرآن وسنت اور فقہ اسلامی ہے انہیں کی تعلیم وتعلّم اور دعوت وتبلیغ مدارس عربیہ دینیہ کا مقصود اصلی ہیں، بالفاظ دیگر یہ دینی تعلیمی وتربیتی ادارے علوم شریعت اسلامی کے نقیب اور فرائضِ نبوت: تلاوت قرآن، تعلیم کتاب اور نفوس انسانی کی تطہیر وتہذیب کے مراکز ہیں۔

ماضی قریب میں ان تعلیمی مراکز نے اس عظیم امانت کی حفاظت اور اس قابل صد فخر امانت کو ملت اسلامیہ تک منتقل کرنے میں جو نمایاں کردار ادا کیا ہے وہ ہماری علمی وثقافتی تاریخ کا ایک زرّیں باب ہے، یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا اعتراف کئے بغیر کوئی منصف مزاج مؤرخ نہیں رہ سکتا، آج بھی یہ اسلامی مدارس اپنے وسائل وذرائع کے مطابق مصروف عمل ہیں اور ملت اسلامیہ کی اولین واہم ترین ضرورت کی کفالت کررہے ہیں۔

علمِ دین سیکھنے والے کو اس بات کا خیال رہے کہ علمی دنیا میں انھیں کامیابی اسی وقت مل سکتی ہے جب وہ علم کو دین کے حصول کے لئے سیکھیں، محی السنۃ حضرت مولانا ابرار الحق رحمۃ اللہ فرماتے ہیں: ہمارا نام طالب العلم والعمل تھا، مگر اختصار کے لیے صرف طالب علم بولا جاتا ہے، ہم عمل کو اب مقصود ہی نہیں سمجھتے، طالب علمی ہی سے اعمال میں مشغول ہونے کا اہتمام کرنا چاہیے، اپنی تربیت اور اصلاح نفس کی فکر ہونی چاہئے، صرف عمدہ رہائش اور روٹیوں کی فکر ہی نہیں بلکہ علم کی روح اور حقیقت حاصل کرکے تعلق مع اللہ اور خشیت بھی پیدا کرنی ضروری ہے۔

طلبۂ مدارس کو یہ بات ذہن نشین کرلینی چاہیے کہ قرآن وحدیث کے جس علم کے حصول میں وہ لگے ہوئے ہیں، اس کا نصب العین دنیا کے تمام کاموں سے بلند ہے، اس کے بلند اور مہتم بالشان ہونے کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہوسکتی ہے کہ طالبِ علم وراثتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا حقدار ہوتا ہے، وہ انسانیت کی تقدیر بدل سکتا ہے، اسی سے ہدایت وروحانیت کے چشمے پھوٹتے ہیں، جس طالبِ علم کے ذہن میں دینی تعلیم کے اس عظیم مقصد کا استحضار ہوگا، وہ اپنی ساری توانائیوں کو علم کے لیے جھونک دے گا، اور پھر مستقبل میں ملت کے لئے بہترین سرمایہ ثابت ہوگا، دینی مدارس میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ اپنے مدارس کے اساسی مقصد کو سمجھیں اور اللہ ورسول اور خود اپنے سرپرستان کی نظر میں سرخروئی حاصل کریں۔

پورے برصغیر میں مدارس دینیہ اور ان میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کرام کی تعداد دن

بدن بڑھتی جارہی ہے، کچھ سالوں سے مدارس میں اس حد تک اضافہ دیکھنے میں آرہا ہے کہ ماضی میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا، الحمدللہ وقت کے ساتھ ساتھ مدارس دینیہ نے معاشرے میں اپنے پاؤں مضبوط کیے ہیں، کچھ ہی عرصے میں بے انتہا ترقی کی ہے، اس سب کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ زمانے کے ساتھ ساتھ جہاں مدارس دینیہ اور طلبہ کی تعداد بڑھی ہے وہیں مدارس دینیہ میں ماضی اور حال کے مقابلے میں علمی اور عملی اعتبار سے کھلا فرق بھی نظر آنا شروع ہوا ہے۔

ماضی میں مدرسہ استاذ اور طالب علم کا نام ہوتا تھا، مدارس کی عمارتیں کوئی بڑی شاندار نہیں ہوتی تھیں، جہاں پڑھانے کے لیے جگہ میسر آگئی وہیں تعلیم کا سلسلہ شروع کردیا جاتا تھا، نہ بجلی کا انتظام اور نہ بیٹھنے کے لیے کوئی اعلیٰ قسم کے قالین ہوتے تھے، بلکہ بہت سے مدارس تو ایسے بھی ہوتے تھے کہ ان میں طلبہ کو کھانے اور رہائش کے بھی بے پناہ مسائل سے دوچار ہونا پڑتا تھا، طلبہ کو مدارس دینیہ میں اب جتنی بھی سہولیات مہیا ہیں ان کا شاید ماضی میں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا، نہ ہی طلبہ ان سہولیات کی جانب التفات کرتے تھے کیونکہ ان کا مقصد صرف علم دین حاصل کرنا اور حاصل کیے ہوئے علم پر عمل کرنا ہوتا تھا، وہ تمام مشکلات برداشت کرکے بھی علم دین حاصل کرتے تھے، تمام مشکلات کے باوجود مدارس دینیہ کے طلبہ علم دین کے حصول میں اس قدر منہمک ہوتے تھے کہ انہیں تعلیم وتعلم کے علاوہ دنیا ومافیہا کی کوئی فکر نہ ہوتی تھی، بلاوجہ کی چھٹی کا مدارس میں کوئی تصور نہ تھا، طلبہ اپنا فارغ وقت بھی علم کے حصول میں صرف کرتے تھے، طلبہ مدارس میں صرف یہی مقصد لے کر آتے تھے کہ ہمیں اپنی پوری زندگی اللہ کے دین کے لیے وقف کرنی ہے، طالب علم جب فراغت حاصل کرتے تو نصابی کتابوں کے ساتھ سیکڑوں مفید خارجی کتب کا مطالعہ بھی کرچکے ہوتے تھے۔

جوں جوں زمانہ گزرتا رہا توں توں طلبہ میں علمی واخلاقی سطح پہ بھی انحطاط آتا جارہا ہے، اب طلبہ میں نہ تو نصابی کتابوں کے مطالعہ کا ذوق رہا اور نہ ہی خارجی کتابوں سے کوئی سروکار، اکثر

طلبہ کو زمانہ طالب علمی میں ہی اپنے مستقبل کا فکر کھائے جاتا ہے، بہت سے تو درمیان تعلیم کوئی کاروبار بھی شروع کردیتے ہیں، جس کی وجہ سے ان میں علمی استعداد پیدا نہیں ہوتی نہ وہ صحیح طریقے سے علم حاصل کرسکتے ہیں اور نہ ہی کاروبار، اساتذہ کا ادب بھی رفتہ رفتہ دم توڑتا جارہا ہے، آٹھ دس سال مدارس میں گزارنے کے باوجود فرائض و واجبات میں بھی سستی آنا شروع ہوجاتی ہے، طلبہ نے علمی وادبی شوق کی بجائے بہت سے ایسے شوق پال لیے ہیں، جس کی وجہ سے اکثر طلبہ میں علوم وفنون میں مضبوطی نہیں آتی، اور ایسے بہت ہی کم طلبہ سامنے آتے ہیں جو اکابر کے مزاج کے مطابق چلیں اور ایسا علمی کام کریں جس کی امت مسلمہ کو ضرورت ہے۔

مفکرِ اسلام حضرت مولانا علی میاں ندویؒ طلباءِ مدارسِ اسلامیہ سے خطاب کے دوران خصوصیت کے ساتھ دو چیزوں کی طرف متوجہ فرمایا کرتے تھے، اخلاص، اختصاص، اخلاص تو علماء اور طلباء کے لیے اشد ضروری ہے، اخلاص کا اثر جہاں اعمال پر پڑتا ہے، وہیں طلبہ کی استعداد وصلاحیت اور علمی کمال پر بھی پڑتا ہے، دنیا کی بڑی سے بڑی شخصیت کے کمال کے پیچھے اخلاص ہی کارفرما رہا ہے، طلبہ کو دورانِ تعلیم اخلاص کی عملی مشق کی کوشش کرنی چاہیے، اعمال کا محاسبہ کرنا چاہیے، اس کے لیے ابھی سے کسی شیخِ کامل کے ہاتھ میں ہاتھ دے دینا چاہیے، اعمال واخلاص کے سلسلہ میں یہ خیال کہ فراغت کے بعد توجہ دی جائے گی انتہائی غلط ہے۔

دوسری چیز اختصاص ہے، موجودہ دَور اختصاص کا دَور ہے، اس دَور میں وہی شخص اپنی افادیت ثابت کرسکتا ہے جو کسی فن میں اختصاص رکھتا ہو اور اس مقام پر پہنچ چکا ہو جہاں لوگ اس کے محتاج ہوجائیں، ویسے طلبہ کو ہر کتاب میں محنت کرنی چاہیے، تاہم جس فن سے ان کو خصوصی دلچسپی یا مناسبت ہو، دورانِ تعلیم ہی سے اس میں خصوصی محنت شروع کرنی چاہیے، متعلقہ اساتذہ کی نگرانی میں اس فن کی کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیے، اس کا اثر یہ ہوگا کہ فراغت تک فن سے غیر معمولی تعلق پیدا ہوگا اور بعد میں مستقل اس کورس میں حصہ لینا بھی آسان ہوگا۔

درسِ قرآن

ان شاء اللہ

مولانا محمد ساجد حسن سہارنپوری استاذ حدیث وتفسیر جامعہ مظاہر علوم سہارنپور

وَلَا تَقُولَنَّ لِشَيْءٍ إِنِّي فَاعِلٌ ذَلِكَ غَدًا۔ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللهُ وَاذْكُرْ رَبَّكَ إِذَا نَسِيتَ وَقُلْ عَسَى أَنْ يَهْدِيَنِ رَبِّي لِأَقْرَبَ مِنْ هَذَا رَشَدًا۔

ہرگز ہرگز کسی کام کے لئے یوں نہ کہنا کہ میں اسے کل کروں گا مگر ساتھ ہی ان شاء اللہ کہہ لینا، اور جب بھی بھول جائیں تو اپنے پروردگار کو یاد کرلیا کرنا اور کہتے رہنا کہ مجھے پوری امید ہے کہ میرا رب مجھے اس سے بھی زیادہ بات دلیل (نبوت) بننے کی بتادے۔

شانِ نزول:

قریشیوں نے نضر بن حارث اور عقبہ بن ابی معیط دو آدمیوں کو مدینہ کے یہودی علماء کے پاس بھیجا کہ تم جا کر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے کل حالات ان سے بیان کرو، اور پوچھو! کہ آپ کی بابت ان کی کیا رائے ہے؟ کیونکہ ان کو انبیاءؑ کا علم ہے، یہ دونوں مدینے گئے، اور علما یہود سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات واوصاف اور آپ کی تعلیم کا ذکر کیا اور کہا کہ تم ذی علم ہو، بتلاؤ ان کی نسبت کیا خیال ہے؟ انھوں نے کہا: دیکھو! ہم تمھیں ایک فیصلہ کن بات بتلاتے ہیں، تم جا کر ان سے تین سوالات کرو، اگر وہ ان کے جواب دیدیں تو بے شک وہ خدا کے نبی اور رسول ہیں، اسے نبی مان کر اس کا اتباع کرو اور اگر جواب نہ دے سکیں تو ان کے جھوٹا ہونے میں بھی کوئی شک نہیں، پھر تم جو چاہو ان کے ساتھ برتاؤ کرو۔

(۱) ان سے اصحاب کہف کا واقعہ پوچھو، وہ ایک عجیب واقعہ ہے۔

(۲) ذوالقرنین کے حالات معلوم کرو

(۳) روح کی ماہیت دریافت کرو۔

یہ دونوں وہاں سے واپس آئے اور قریشیوں سے کہا لو بھائی! آخری اور انتہائی فیصلے کی بات انھوں نے بتلادی ہے، اب چلو ان سے سوالات کریں، چنانچہ یہ سب آپ کے پاس آئے اور تینوں سوالات کئے، آپ نے وحی کے بھروسے فرمایا: تم کل آؤ میں تمھیں جواب دوں گا، لیکن ان شاء اللہ کہنا بھول گئے، پندرہ دن گذر گئے، نہ آپ پر وحی آئی نہ اللہ کی طرف سے ان باتوں کا جواب بتایا گیا، اہل مکہ کہنے لگے لیجئے صاحب! کل کا وعدہ تھا آج پندرھواں دن ہے لیکن وہ بتلا نہیں سکے، ادھر آپ کو دہرا غم ستانے لگا، قریشیوں کی باتیں سننے کا اور دوسرا وحی کے بند ہوجانے کا، پھر حضرت جبرئیلؑ آئے سورۂ کہف نازل ہوئی اسی میں ان شاء اللہ نہ کہنے پر آپ کو ڈانٹا گیا۔

تشریح:

خطاب آپ کو ہے، ادب امت کو سکھانا ہے کہ جب بھی کسی کام کے کرنے کا عزم وارادہ یا وعدہ ہو تو اس کو ان شاء اللہ کہہ کر مضبوط بنالینا چاہئے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ''میں یہ کام کروں گا، اور اگر خدا نے چاہا تو یہ کام ہوگا، اور اگر ارادہ و وعدہ کرتے وقت ان شاء اللہ کہنا یاد نہیں رہا جب یاد آئے تب کہہ لے، حصول برکت کے واسطے اتنا بھی کافی ہے۔

ان شاء اللہ کہنے سے کام میں حق تعالیٰ کی طرف سے مدد و برکت، آسانی و سہولت میسر ہوتی ہے۔

نیز یہ کہنا اس لئے بھی ضروری ہے کہ اللہ کے چاہے بغیر کچھ بھی نہیں ہوتا۔

قرآن کریم میں ان شااللہ نہ کہنے کا ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے، جس

واقعہ کی تفصیل:

بقول حضرت سعید بن جبیرؓ یہ واقعہ صنعاء سے چھ میل کے فاصلہ پر واقع یمن کی ایک بستی صروان میں پیش آیا جس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ سے تھوڑے زمانہ کے بعد اہل کتاب میں کا

ایک آدمی بہت مالدار، زمین وجائداد کا مالک، کریم النفس، سخی اور خدا ترس تھا، اپنے باغ، کھیت کی آمدنی میں غرباء، یتامیٰ، مساکین، بیوگان کے وظیفے وروزینے مقرر کر رکھے تھے اور کثیر مقدار میں فقراء پر خرچ کرتا تھا، اس کا جب انتقال ہو گیا تو چند لڑکے وارث چھوڑے، (**فلما مات ورث ثلثة بنيه**)، جو آپس میں کہنے لگے "ہمارا باپ تو بڑا ہی بے وقوف تھا جو اتنی کثرت سے مال لٹاتا تھا، اور ہم تو عیالدار ہیں، اخراجات ومصارف ہی پورے نہیں ہوتے، اور پھر ہم اتنے پاگل بھی نہیں کہ اپنی محنت اور خون پسینے کی کمائی کو یوں ضائع کردیں (**والله ان المال لقليل وان العيال كثير وانما كان هذا الامر يفعل اذا كان المال كثيرا والعيال قليلا**) صلاح ٹھہری کہ پھل توڑنے اندھیرے منہ اور اتنے صبح چلو کہ فقراء وغرباء کو کانوں کان خبر نہ ہو، یہ مشورہ اور ارادہ کرتے ہوئے انہوں نے ان شاء اللہ بھی نہیں کہا (**فحلفوا على ان يجذوه قبل الشمس**)۔

ان میں سے ایک نے فہمائش بھی کی کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے رحمتوں وبرکتوں کا نزول ہوتا ہے اور غرباء کی دست گیری سے مزید الطاف وعنایات ربانی واقع ہوتی ہیں مگر اس کی ایک نہ سنی۔ (**قال اوسطهم الم اقل لكم لولا تسبحون**)۔

ایک طرف تو یہ بخلاء وحمقاء مشورہ وسرگوشیاں کر رہے ہیں کہ نہ خدا کا حق ادا کریں اور نہ بندگانِ خدا کا، دوسری طرف خدائی قہر وغضب آگ کی شکل میں نمودار ہوا اور سرسبز وشاداب، رشکِ تمنا لہلہاتے باغ کو راتوں رات، راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کردیا۔

مشورہ کے مطابق علی الصباح چھپتے چھپاتے، فقراء وغرباء کی نظروں سے بچتے بچاتے، جب باغ پر پہونچے تو معاملہ دگرگوں پایا اور سمجھے یہ ہمارا باغ ہی نہیں ہے (**قالوا انا لضالون**) مگر علامات اور آثار وقرائن سے پہچان پائے کہ باغ ہمارا ہی ہے، اور حسرت ویاس سے کف افسوس ملتے اور کہتے جاتے، یہ سب نتیجہ ہے مساکین ویتامی کو ان کے حق سے محروم کردینے کا، اللہ کے چاہے بغیر کوئی نیک کام بھی پورا نہیں ہوتا، اور بندے کی وہی خواہش اور ارادہ پورا ہوتا ہے جس میں مشیت الٰہی بھی شامل ہو، حتی کہ اللہ کے چاہے بغیر

کوئی نیک کام بھی پورا نہیں ہوتا۔

ایک دن حضرت سلیمانؑ نے عزم و ارادہ کیا کہ آج رات میں اپنی نوّے بیویوں (اور ایک روایت میں ہے کہ اپنی سو بیویوں) کے ساتھ مباشرت کروں گا اور ان میں سے ہر بیوی ایک سوار (بہادر مرد) جنے گی جو اللہ کے راستہ میں جہاد کرے گا، (چونکہ انہوں نے اس عزم وارادہ کے وقت، ان شاء اللہ نہیں کہا اس لئے اس) فرشتہ نے جو دائیں طرف رہتا ہے یا حضرت جبرئیل نے اور یا کسی بھی فرشتہ نے، ان سے کہا کہ ان شاء اللہ کہہ لیجئے! لیکن حضرت سلیمانؑ "ان شاء اللہ" کہنا بھول گئے، (بقول ملا علی قاری، فرشتے کے کہنے کے باوجود حضرت سلیمان نے ان شاء اللہ" اس لئے نہیں کہا کیونکہ انھیں یہ خیال ہوا کہ جب دل میں (ان شاء اللہ کی) نیت کرلی ہے تو زبان سے ان شاء اللہ کہنا ضروری نہیں ہے، حالانکہ زبان سے ان شاء اللہ کہنے میں دل اور زبان دونوں کا جمع ہونا، اہل عرفان کے نزدیک اصل درجہ رکھتا ہے،) پھر انھوں نے (اپنے ارادہ کے مطابق) ان سب بیویوں کے ساتھ مباشرت کی اور صرف ایک بیوی کے علاوہ کوئی بھی حاملہ نہیں ہوئی اور اس نے بھی ناقص الخلقت بچہ جنا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، سلیمانؑ اگر ان شاء اللہ کہہ لیتے تو یقیناً ہر عورت سے بیٹا پیدا ہوتا اور وہ سب اللہ کے راستہ میں جہاد کرتے اور بہادر ثابت ہوتے۔

قَالَ رَسُولُ اللهِ - صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :قَالَ سُلَيْمَانُ :لَأَطُوفَنَّ اللَّيْلَةَ عَلَى تِسْعِينَ امْرَأَةً - وَفِي رِوَايَةٍ:بِمِائَةِ امْرَأَةٍ كُلُّهُمْ تَأْتِي بِفَارِسٍ يُجَاهِدُ فِي سَبِيلِ اللهِ فَقَالَ لَهُ الْمَلَكُ:قُلْ إِنْ شَاءَاللهُ فَلَمْ يَقُلْ وَنَسِيَ، فَطَافَ عَلَيْهِنَّ، فَلَمْ تَحْمَلْ مِنْهُنَّ إِلَّا امْرَأَةٌ وَاحِدَةٌ جَاءَتْ بِشِقِّ رَجُلٍ، وَأَيْمُ الَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ،لَوْ قَالَ:إِنْ شَاءَاللهُ، لَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللهِ فُرْسَانًا أَجْمَعُونَ . (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.)

انوارِ حدیث

علم دین سیکھنے سکھانے والوں کا مرتبہ

حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ

عَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: مَنْ سَلَكَ طَرِيقًا يَطْلُبُ فِيهِ عِلْمًا سَلَكَ اللهُ بِهِ طَرِيقًا مِنْ طُرُقِ الْجَنَّةِ وَإِنَّ الْمَلائِكَةَ لَتَضَعُ أَجْنِحَتَهَا رِضًا لِطَالِبِ الْعِلْمِ وَإِنَّ الْعَالِمَ لَيَسْتَغْفِرُ لَهُ مَنْ فِي السَّمٰوَاتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ وَالْحِيتَانُ فِي جَوْفِ الْمَاءِ وَإِنَّ فَضْلَ الْعَالِمِ عَلَى الْعَابِدِ كَفَضْلِ الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ عَلَى سَائِرِ الْكَوَاكِبِ وَإِنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ وَإِنَّ الْأَنْبِيَاءَ لَمْ يُوَرِّثُوا دِينَارًا وَلاَ دِرْهَمًا وَرَّثُوا الْعِلْمَ فَمَنْ أَخَذَهُ أَخَذَ بِحَظٍّ وَافِرٍ. (رواہ احمد والترمذی وابوداؤد وابن ماجہ والدارمی)

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے تھے کہ جو بندہ (دین کا) علم حاصل کرنے کے لئے کسی راستہ پر چلے گا اللہ تعالیٰ اس کے عوض اس کو جنت کے راستوں میں سے ایک راستے پر چلائے گا اور (آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ) اللہ کے فرشتے طالبان علم کے لئے اظہار رضا (اور اکرام واحترام) کے طور پر اپنے بازو جھکا دیتے ہیں اور (فرمایا کہ) علم دین کے حامل کے لئے آسمان وزمین کی ساری مخلوقات اللہ تعالی سے مغفرت کی استدعا کرتی ہیں یہاں تک کہ دریا کے پانی کے اندر رہنے والی مچھلیاں بھی اور (آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا) عبادت گزاروں کے مقابلہ میں حاملین علم کو ایسی برتری حاصل ہے جیسی کے چودھویں رات کے چاند کو آسمان کے باقی ستاروں پر اور (یہ بھی فرمایا کہ) علماء انبیاء کے وارث ہیں اور انبیاء علیہم السلام نے دیناروں

اور درہموں کا ترکہ نہیں چھوڑا ہے، بلکہ انہوں نے اپنے ترکے اور ورثے میں صرف علم چھوڑا ہے تو جس نے اس کو حاصل کرلیا اس نے بہت بڑی کامیابی اور خوش بختی حاصل کرلی۔

تشریح: فی الواقع انبیاء علیہم السلام کی میراث ان کا لایا ہوا وہ علم ہی ہے جو بندوں کی ہدایت کے لیے وہ اللہ تعالی کی طرف سے لائے، اور جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا وہ اس کائنات کی سب سے قیمتی دولت ہے، طبرانی نے معجم اوسط میں یہ واقعہ روایت کیا ہے کہ ایک دن حضرت ابوہریرہؓ بازار کی طرف سے گزرے، لوگ اپنے کاروبار میں مشغول تھے، آپ نے ان سے فرمایا کہ تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے تم یہاں ہوں اور مسجد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث تقسیم ہو رہی ہے، لوگ مسجد کی طرف دوڑے اور واپس آ کر کہا کہ وہاں تو کچھ بھی نہیں بٹ رہا، کچھ لوگ نماز پڑھ رہے ہیں، کچھ قرآن کی تلاوت کررہے ہیں کچھ لوگ حلال وحرام کی یعنی شرعی احکام و مسائل کی باتیں کررہے ہیں، حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا یہی تو رسول اللہ صلی اللہ وسلم کی میراث اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ترکہ ہے۔(جمع الفوائد ۱/۷۳)۔

عَنِ الْحَسَنِ مُرْسَلًا قَالَ: سُئِلَ رَسُولُ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰہُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ رَجُلَيْنِ كَانَا فِي بَنِي إِسْرَائِيلَ: أَحَدُهُمَا كَانَ عَالِماً يُصَلِّي الْمَكْتُوبَةَ ثُمَّ يَجْلِسُ فَيُعَلِّمُ النَّاسَ الْخَيْرَ، وَالآخِرُ يَصُومُ النَّهَارَ وَيَقُومُ اللَّيْلَ أَيُّهُمَا أَفْضَلُ؟ قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰہُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: فَضْلُ هَذَا الْعَالِمِ الذي يُصَلِّي الْمَكْتُوبَةَ ثُمَّ يَجْلِسُ فَيُعَلِّمُ النَّاسَ الْخَيْرَ عَلَى الْعَابِدِ الذي يَصُومُ النَّهَارَ وَيَقُومُ اللَّيْلَ كَفَضْلِي عَلَى أَدْنَاكُمْ.(رواہ الدارمی)

حضرت حسن بصری نے بطریق ارسال روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی اسرائیل کے ایسے دو آدمیوں کے بارے میں دریافت کیا جن میں سے ایک کا معمول یہ تھا کہ وہ فرض نماز پڑھتا پھر بیٹھ کر لوگوں کو اچھی نیکی کی باتیں بتلاتا اور دین کی تعلیم دیتا اور دوسرے صاحب کا حال یہ تھا کہ وہ دن کو برابر روزہ رکھتے اور رات کو کھڑے ہو کر نوافل پڑھتے (آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا) کہ ان دونوں میں کون افضل اور اعلیٰ

ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ عالم جو فرض نماز ادا کرتا ہے پھر لوگوں کو دین اور نیکی کی باتیں سکھانے کے لیے بیٹھ جاتا ہے اس کو اس صائم النہار اور قائم اللیل عابد کے مقابلہ میں اس طرح فضیلت حاصل ہے جس طرح کی تم میں سے کسی ادنیٰ آدمی پر مجھے فضیلت حاصل ہے۔(مسند دارمی)

تشریح: مندرجہ بالا حدیث میں ''علماء'' اور ''معلمین'' کی جو غیر معمولی عظمتیں اور فضیلتیں بیان کی گئی ہیں ان کی لم اور ان کا راز یہی ہے کہ علم اللہ تعالی کا نازل فرمایا ہوا نور ہدایت ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ آیا ہے اور دنیا سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اٹھا لئے جانے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا الٰہی علم (جو قرآن و حدیث میں ہے) امت کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ ہستی کے قائم مقام ہے اور جو اس کے بعد حامل اور امین علما و معلمین ہیں وہ زندہ انسانوں کی شکل میں حضور صلی اللہ وعلیہ وسلم کے قائم مقام ہیں وہ نبی تو نہیں ہیں لیکن وارث انبیاء ہونے کی حیثیت سے کار نبوت سنبھالے ہوئے ہیں اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا کام انجام دے رہے ہیں گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست و بازو اور آلۂ کار ہیں، اسی خصوصیت نے انکو اس مقام و مرتبہ پر پہنچا دیا ہے اور ان غیر معمولی انعامات الٰہیہ کا مستحق بنا دیا ہے، لیکن اس کی شرط یہ ہے کہ تعلیم و تدریس خالصا لوجہ اللہ اجر آخرت کے لئے ہو اگر خدانخواستہ یہ دنیوی اغراض کے لیے ہو تو بدترین معصیت ہے اور ایک صحیح حدیث کی صراحت کے مطابق ان لوگوں کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ اَللّٰھُمَّ احفظ

ایک ضروری وضاحت

اس سلسلہ میں یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے ہمارے اس زمانے میں دینی مدارس اور دار العلوموں کی شکل میں علم دین کی تحصیل و تعلیم کا جو نظام قائم ہے اس کی وجہ سے جب ہمارے دینی حلقوں میں طالب علم کا لفظ بولا جاتا ہے تو ذہن ان دینی مدارس میں تعلیم حاصل کرنے والے طالب علموں ہی کی طرف جاتا ہے اسی طرح عالم دین یا معلم دین کا لفظ سن کر ذہن اصطلاحی وعرفی علماء اور

دینی مدارس میں تعلیم دینے والے اساتذہ ہی کی طرف منتقل ہوتا ہے اور پھر اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ معلمین دین کے جو فضائل ومناقب بیان ہوئے ہیں اور ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہونے والے جن غیر معمولی انعامات کی بشارت دی گئی ہیں ان سب کا مقصدان مدارس ہی کے تعلیمی سلسلہ کو اور ان کے طلبا اور معلمین ہی کو سمجھ لیا جاتا ہے، حالانکہ جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے عہد نبوی میں اور اسکے بعد صحابہ کرامؓ بلکہ تابعین کے دور میں بھی اس طرح کا کوئی تعلیمی اور تدریسی سلسلہ نہیں تھا نہ مدارس اور دارالعلوم تھے نہ کتابیں پڑھنے اور پڑھانے والے طلبہ اور اساتذہ کا کوئی طبقہ تھا بلکہ سرے سے کتابوں ہی کا وجود نہیں تھا بس صحبت وسماع ہی تعلیم وتعلم کا ذریعہ تھا، صحابہ کرامؓ نے (ان کے درجہ اول کے علماء وفقہاء مثلاً خلفائے راشدین، معاذ بن جبل، عبداللہ بن مسعود، ابی بن کعب، زید بن ثابت وغیرہ رضی اللہ عنہم اجمعین نے بھی) جو کچھ حاصل کیا صرف صحبت وسماع ہی کے ذریعہ حاصل کیا تھا اور بلاشبہ وہ حضرات ان حدیثوں اور بشارتوں کے اولین مصداق تھے۔

راقم سطور عرض کرتا ہے کہ آج بھی جو بندگان خدا کسی غیر رسمی طریقے سے مثلاً صحبت وسماع ہی کے ذریعہ اخلاص کے ساتھ دین سیکھنے اور سکھانے کا اہتمام کریں وہ بھی یقیناً ان حدیثوں کے مصداق ہیں اور بلاشبہ ان کے لیے بھی یہ سب بشارتیں ہیں، بلکہ ان کو اصطلاحی وعرفی طلباء اور معلمین پر ایک فضیلت وفوقیت حاصل ہے، کیونکہ جو بے چارے اصلاح وارشاد کی مجالس میں یا کسی بھی دینی حلقہ میں اپنی دینی اصلاح اور دین سیکھنے کی نیت سے شریک ہوتے ہیں یا دین سیکھنے سکھانے والے کسی جماعت کے ساتھ اس مقصد سے کچھ وقت گزارتے ہیں، ظاہر ہے کہ وہ اس سے کسی دنیوی منفعت کی توقع نہیں کر سکتے اس لئے ان کی غیر رسمی طالبعلمی یا معلمی بالکل بے غل وغش صرف اللہ ہی کے لئے اور آخرت ہی کے واسطے ہوتی ہے، اللہ کے ہاں اسی عمل کی قدر وقیمت ہوتی ہے جو خالصاً لوجہ اللہ ہو۔

یہ وضاحت یہاں اس لئے ضروری سمجھی کہ ہمارے اس زمانے میں ”عالم“، ”معلم“ اور طالب علم کے مصداق کے بارے میں مذکورہ بالا غلط فہمی بہت عام ہیں اگرچہ غیر شعوری طور پر ہے۔

حضرت حکیم الامت اور سماجی اصلاح

ڈاکٹر جسیم الدین
پوسٹ ڈاکٹورل فیلو، شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی، دہلی

مولانا اشرف علی تھانوی کی شخصیت مثالی شخصیت تھی، آپ کے اقوال واعمال اور مثالی زندگی نے لاکھوں انسانوں کی زندگیوں کو اچھے اخلاق واعمال سے آراستہ کیا، آپ کے علمی واصلاحی کارنامے عرصۂ دراز تک آنے والی نسلوں کے لیے رہنمائی کے چراغ روشن کرتے رہیں گے، مولانا اشرف علی تھانوی کی شخصیت سورج کی طرح تھی، جس کا کام ہی اندھیروں کو دور کرنا اور روشنی پھیلانا ہے، مولانا تھانوی نے عمر بھر معاشرے کی اصلاح کی، معاشرے میں پھیلی ہوئی برائیوں اور ان کے نقصانات سے دنیا کو آگاہ کیا، ہندوستان کے مسلم معاشرے میں آج جو تھوڑی بہت روشنی پائی جاتی ہے، اس میں بلاشبہ مولانا اشرف علی تھانوی کا کردار بہت نمایاں ہے، وہ نہ ہوتے تو شاید ہمارا معاشرہ توہمات اور تاریکیوں کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہوتا، یہ ان کی فکر کی ہی روشنی ہے کہ آج ہمارے پاس ایک مضبوط علمی مذہبی اور فکری سرمایہ ہے، جس کی روشنی میں ہم ٹیڑھے میڑھے راستوں سے گزر کر بھی منزلِ مقصود تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔

مولانا اشرف علی تھانوی اپنے اصلاحی کاموں کی بدولت حکیم الامت کہلائے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ واقعتاً انھوں نے تجدید واصلاح کا جو فریضہ انجام دیا، وہ بیسویں صدی میں دوسرے لوگ انجام دینے سے قاصر رہے، خدا نے انھیں ''حسنِ حکمت'' سے نوازا تھا اور وہ بلند نگاہ عطا کی تھی، جس سے وہ انسانی معاشرے کے ذہنی وفکری امراض کی تشخیص کر کے ان کا مداوا ڈھونڈ لیتے تھے، خدا نے انھیں اجتہادی قوت سے بھی مالامال کیا تھا، جس کی بدولت وہ شرعی مسائل واحکام بھی کتاب وسنت کی روشنی میں بیان کرتے تھے، مولانا تھانوی ایک خانقاہ میں محصور انسان نہ تھے؛ بلکہ سماج

کے اطراف وجوانب پہ ان کی نگاہ تھی، وہ زندہ ضمیر اور بیدار ذہن انسان تھے، انھیں حالات کے تغیرات اور ماحول کی تبدیلیوں کا گہرا عرفان تھا، ان کے سامنے پچھلی صدیاں بھی تھیں، موجودہ ماحول اور معاشرہ بھی تھا، انھوں نے ماضی سے حال کو منور کرنے کا طریقہ اختیار کیا، انھوں نے خیر القرون سے اپنا ذہنی وفکری رشتہ قائم رکھا؛ اس لیے ان کے یہاں جو فکر اور احساس کی سطح پر روشنی ملتی ہے، وہ روشنی نہایت پاکیزہ اور انسانی وجود و کائنات کو روشن کرنے والی ہے۔

مولانا اشرف علی تھانوی مختلف سطحوں پر متحرک اور مختلف عملی شعبوں میں سرگرم رہے اور یہ سرگرمی اپنی ذات کی تشہیر کے لیے نہیں تھی؛ بلکہ اس میں پوری ملت وانسانیت کا مفاد شامل تھا، ان کا دائرۂ عمل محدود نہیں؛ بلکہ متنوع اور وسیع تھا، انھوں نے کتابیں بھی لکھیں اور مواعظ بھی کہے، انھوں نے معاشرے کی اصلاح بھی کی، مجاہدہ بھی کیا، ریاضت بھی کی اور مشاہدہ بھی کیا، وہ ایک متحرک اور انقلابی شخصیت کے مالک تھے، جنھوں نے اپنی فکر سے پورے سماجی نظام کو بدل ڈالا، اگر وہ فکری طور پر کمزور ہوتے، تو شاید معاشرے کے رنگ میں ڈھل جاتے، مگر انھوں نے خود کو معاشرے میں مدغم نہیں کیا؛ بلکہ اپنی اصلاحی فکر سے معاشرے کو منور کیا، ان کی ہزاروں تصانیف گواہی دے رہی ہیں کہ مولانا تھانوی کا مشن کیا تھا اور ان کا مقصدِ حیات کیا تھا، مولانا اشرف علی تھانوی نے ''بہشتی زیور'' کے ذریعے مسلم خواتین میں انقلاب برپا کیا، ''بہشتی زیور'' میں انھوں نے خواتین کے لیے جو کچھ بھی لکھا، پورے نسائی سماج کے لیے مشعلِ راہِ ہدایت ہے، جو خواتین پاکیزہ ذہن کی ہیں، اسی کتاب سے اپنی زندگی کا سفر طے کر رہی ہیں، ان کے لیے یہ کتاب وہ ضابطۂ حیات ہے، جس کی رو سے وہ اپنی زندگی کے ہر لمحے کو جانچتی اور پرکھتی ہیں، اپنے گناہوں کی سزا اور اپنے نیک اعمال کے ثواب کا حساب کرتی ہیں، اس کتاب کو اتنی مقبولیت حاصل ہے کہ ہر نئی نویلی دلہن اپنے سسرال اس کتاب کی رفاقت ومعیت میں جاتی ہے۔

عام انسانوں کے لیے انھوں نے ''آداب المعاشرت'' نامی کتاب لکھی، جس میں انھوں نے پوری زندگی کے طور طریقے بتادیئے، روزمرہ کی زندگی کے عام اصولوں کو بہت ہی مؤثر انداز میں بیان کیا، اگر

انسان صرف اس کتاب کی روشنی میں زندگی بسر کرنا شروع کردے، تو انسانی معاشرے میں ایک دوسرے سے سارے گلے شکوے دور ہوجائیں گے، اس کتاب میں صبح سے لے کر شام تک کی نشست و برخاست سے لے کر ایک دوسرے سے ملاقات و معاملات کو الگ الگ درس کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔

مولانا اشرف علی تھانوی بیسویں صدی کے مصلح اور ریفارمر تھے، انھوں نے اپنے اس منصب سے کسی بھی لمحہ مفاہمت نہیں کی، وہ ہمیشہ مختلف ذریعوں سے اصلاح و تبلیغ کا کام انجام دیتے رہے اور یہی اصلاحی اور تجدیدی کارنامہ ہے، جس کی وجہ سے مولانا کا نام پوری دنیا میں انتہائی عزت و احترام سے لیا جاتا ہے۔ مولانا تھانوی زندگی کے تمام تر معاملات سے واقف تھے اور انھوں نے انسانی معاشرے کو درپیش مسائل پر کوئی نہ کوئی رسالہ ضرور لکھا ہے، ان کی تصانیف میں ہر ایک دل، ذہن اور ضمیر کے لیے کچھ نہ کچھ روشنی ضرور موجود ہے، چاہے اس کا تعلق کسی قوم و مذہب سے ہو، کسی ملک، کسی رنگ و نسل سے ہو، ان کے یہاں بنی نوع انسان کی بہتری اور فلاحِ انسانیت کی باتیں ہی ہوتی ہیں اور یہی خدا کا پیغام بھی ہے اور اسی پیغام کی ترسیل کا ایک مؤثر ذریعہ خداوند قدوس نے مولانا تھانوی کی شکل میں پیدا کیا تھا، مولانا تھانوی نے اپنی تخلیق کا مقصد اور منصب سمجھتے ہوئے بلا کسی قسم کی تفریق کے اپنا فریضہ نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا اور اصلاحِ معاشرہ کے لیے ہر سطح پر کوشش کی، معاشرہ کسی قوم کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے، جس کی قوت اور درستی پر قوم کے وجود، استحکام اور بقا کا انحصار ہے، معاشرے کے بناؤ اور بگاڑ سے قوم براہ راست متاثر ہوتی ہے، معاشرہ اصلاح پذیر ہو، تو اس سے ایک صحت منداور باصلاحیت قوم وجود میں آتی ہے اور اگر معاشرہ بگڑا ہوا ہو، تو اس کا فساد قوم کو گھن کی طرح کھا جاتا ہے، معاشرے کا کردار بننے یا بگڑنے کا عمل فی الفور مکمل نہیں ہو جاتا؛ بلکہ اس میں طویل مدت صرف ہوتی ہے، بگاڑ کی راہ پر چلنے والے معاشرے سے اچھی قدریں ایک ایک کر کے منہدم ہوتی چلی جاتی ہیں، نیک و بد کے بارے میں شدید احساس رکھنے والے لوگ تو اس خرابی کو جلد بھانپ لیتے ہیں؛ لیکن عام لوگوں پر یہ مدتوں کے بعد کھلتی ہے، اسی طرح معاشرے کی اصلاح کا کام بھی ہے، جس طرح ایک بنیاد اٹھا کر اس پر ایک

ایک اینٹ جوڑنے سے دیوار مکمل ہوتی ہے، اسی طرح اصلاح کا کام بھی ایک تعمیر کی منصوبہ بندی چاہتا ہے، منصوبہ بندی کے بغیر اصلاح کا کام بھی نفع بخش نہیں ہوتا، مولانا اشرف علی تھانوی نے نہایت منصوبہ بندی کے ساتھ اصلاحِ معاشرہ کا زریں سلسلہ شروع کیا اور عام لوگوں کے ساتھ علما کی ایک بڑی تعداد نے آپ سے استفادہ کیا، آپ کی خانقاہ اس دور میں مرجعِ خلائق بنی ہوئی تھی، اس میں آپ جہاں اپنے معتقدین کی اصلاح فرماتے، وہیں تصنیف وتالیف میں بھی مصروف رہتے، وعظ وتلقین کے ساتھ بیعت وارشاد کا بھی سلسلہ جاری رہتا۔

اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے گزشتہ ڈیڑھ صدیوں میں جن علما اور بزرگوں کی علمی وتصنیفی خدمات، دعوتی وتبلیغی مساعی اور ان سے وابستہ اشخاص ورجال نے برِّ صغیر کے دینی وعلمی ماحول کو متاثر کیا اور انسانوں کے ایک بڑے طبقے کا رشتہ ان کے حقیقی خالق ومالک سے جوڑا، اُن میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا اسمِ گرامی بہت ممتاز اور نمایاں ہے، انھیں ایک بڑے حلقے میں حکیم الامت کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ لقب ان کے اسمِ گرامی کے ساتھ نہایت مناسب اور موزوں بھی ہے، مولانا تھانوی کی پوری زندگی عامۃ المسلمین کی دینی، اصلاحی اور علمی رہ نمائی سے عبارت ہے، انھوں نے اپنے مشاغل شب و روز کے لیے جو اصول اور ضوابط بنائے تھے، تمام عمر اس کی پابندی کی اور ایسی پابندی کی کہ کبھی اس کے سامنے کسی بڑی سے بڑی شخصیت یا عہدہ ومنصب کی رعایت نہیں فرمائی، اس سلسلے میں ان کے بے شمار واقعات کتابوں میں موجود ہیں اور اہلِ علم کی زبانوں سے بھی سننے کو ملتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اشرف علی تھانوی کسی شخص یا فرد کا نام نہیں؛ بلکہ ایک علمی، روحانی اور تربیتی ادارے کا نام ہے، وہ اپنی ذات میں ایک ایسی دانش گاہ تھے، جس نے اصلاح وتربیت کے لاتعداد پیاسوں کی پیاس بجھائی، وہ سلسلہ بالواسطہ طور پر آج بھی جاری رہے، آج کے دور میں دعوت وتبلیغ اور اصلاح وتربیت کا کام کرنے کے لیے ان کی تعلیمات مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتی ہیں، مولانا تھانوی کی ذات دین پسند حلقوں کے لیے آج بھی باعثِ فیض وبرکت ہے، ان کی

دینی وروحانی خدمات کے نور سے ایک دنیا منور ہے، انھوں نے زبان وقلم کے ذریعے رسولِ کائناتصلی اللہ علیہ وسلم کے نقوشِ حیات کو اجاگر کرنے کا ایسا کارنامہ انجام دیا کہ ایمان ویقین سے تعلق رکھنے والا انسانوں کا ایک بڑا طبقہ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا، وہ اپنے اندر علم و معرفت کا ایک جہان سمیٹے ہوئے تھے، وہ بہ یک وقت قرآنی علوم کے عالم بھی تھے اور احادیث و سیرت کے رمز شناس بھی، حقیقی تصوف کے سمندر کے غوطہ زن بھی تھے اور علمِ فقہ کے اداشناس بھی اور اپنے عہد کے بے مثل واعظ ومتکلم بھی۔

مولانا تھانوی پوری عمر تصنیف وتالیف، دعوت تبلیغ اور اصلاح وتربیت کے مشغلے سے وابستہ رہے، ان کی کتابوں کی تعداد سیکڑوں سے متجاوز ہے، منتسبین ووابستگان ہزاروں کی تعداد میں ہیں، جن کو ایک بڑی جماعت کی حیثیت حاصل ہے، مولانا کے اندر شخصیت سازی اور تعمیر سیرت کی بھی بے پناہ صلاحیت تھی، ان کے فیضِ تربیت سے ایسے ایسے آفتاب و ماہ تاب پیدا ہوئے، جنھوں نے اپنے مرشد کی وفات کے بعد ان کے مشن کو آگے بڑھایا اور دعوت واصلاح کے میدان میں بڑی نمایاں خدمات انجام دیں، ان میں حضرت مولانا شاہ وصی اللہ الہ آبادی، حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب قاسمی مہتمم دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا مسیح اللہ خاں شیروانی، حضرت مولانا شاہ ابرارُ الحق حقی، حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالحی عارفی، خواجہ عزیزالحسن مجذوب، حضرت مولانا سراج احمد خاں امروہوی، حضرت مولانا سید حامد حسین امروہوی اور حضرت مولانا اسعداللہ رام پوری رحمہم اللہ تعالیٰ کے اسماے گرامی نہایت روشن وتاب ناک ہیں۔

مولانا تھانوی نفسیات شناس بھی تھے، انسانوں کی نفسیات کی پہچان میں انھیں گہرا درک حاصل تھا، کس انسان سے کب اور کیا برتاؤ کیا جائے، اس سے وہ بہ خوبی واقف تھے، یہ وہ خوبی ہے، جو اصلاحِ وتربیت اور دعوت وتبلیغ کے کام کے لیے نہایت ناگزیر ہے، اس صلاحیت کے بغیر اس راہ میں کوئی مفید خدمت نہیں انجام دی جاسکتی، اس کے بغیر جو بھی کام ہوگا، وہ اطمینان بخش نہیں ہوگا، جب ہم تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں، تو پتا چلتا ہے کہ اب تک جتنے بھی داعی، مبلغ اور مصلح

ہوئے ہیں، انھوں نے اپنی اسی نفسیات شناسی اور مزاج رسی کی بہ دولت کام یابی حاصل کی ہے۔

مولانا تھانوی عملی زندگی میں بے حد منظم اور بااصول شخص تھے، انھوں نے اِسی نظم وضبط اور اصول وضوابط کی روایت کو اپنے مریدوں اور قریب رہنے والوں میں بھی پروان چڑھانے کی کوشش کی، اس سے ان کی غرض صرف یہ تھی کہ لوگوں کوسکون اور راحت حاصل ہو، ان کا احساس تھا کہ نظم وضبط اور اصول پسندی کے بغیر کوئی دعوت یا تبلیغ موثر نہیں ہوگی، یہ مولانا تھانوی کی زندگی کا ایک ایسا وصف ہے، جو ہمارے آج کے داعیوں، مربّیوں اور مبلغوں کی زندگیوں میں مفقود ہے، افراد سازی آپ نے جس انداز میں کی اس کی نظیر نہیں ملتی ہے۔ ان کی وفات کے بعد ان کی تصنیفات ان کے مشن کی تبلیغ میں لگی ہوئی ہیں اور مولانا تھانوی کا فیض بعد از مرگ بھی جاری ہے، ان کی فکری قندیل سے سماج کو آج بھی روشنی مل رہی ہے اور اندھیرا دور ہو رہا ہے۔

اعلان ملکیت فارم IV

(۱) مقام اشاعت	مدرسہ مظاہر علوم	پتہ	مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور یوپی
محلہ مبارک شاہ سہارنپور (یوپی)		(۴) پرنٹر پبلشر	مولانا محمد سلمان
(۲) مدت اشاعت	ماہانہ	قومیت	ہندوستانی
(۳) ایڈیٹر	مولانا محمد سلمان	پتہ	مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور یوپی
قومیت	ہندوستانی	ملکیت	مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور یوپی

میں (مولانا) محمد سلمان تصدیق کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا امور میرے علم کے مطابق صحیح ہیں

حج بیت اللہ

محدث العصر حضرت علامہ سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ

اللہ تعالیٰ شانہٗ نے یوں تو ہر عبادت کے لیے قدم قدم پر رحمت وعنایت اور اجر وثواب کے وعدے فرمائے ہیں، نماز وزکاۃ اور روزہ واعتکاف وغیرہ سب پر جنت اور جنت کی بیش بہا نعمتوں کے وعدے ہیں، لیکن تمام عبادات میں ''حج بیت اللہ'' کی شان سب سے نرالی ہے۔

حج گویا دبستانِ عبدیت کا آخری نصاب ہے جس کی تکمیل پر بارگاہِ عالی سے رضا وخوشنودی کی آخری سند عطا کی جاتی ہے: کتنے عجیب انداز سے فرمایا گیا ہے: ''والحج المبرور لیس لہٗ جزاء إلا الجنۃ۔'' (مشکوۃ) ''اور حج مبرور کا بدلہ تو بس جنت ہی ہے۔''

گویا حج مبرور ایک ایسی عالی شان عبادت ہے کہ بجز جنت کے اس کا اور کیا بدلہ ہوسکتا ہے! حج مبرور جس کا بدلہ صرف جنت ہی ہو ہے، اس کی تشریح یہ ہے کہ اس میں گناہ کی آلودگی اور ریا کاری کا شائبہ نہ ہو، یعنی تمام سفر حج میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے آدمی بچے اور محض اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر حج کیا جائے، بلاشبہ اس شرط کا نبھانا بھی بہت مشکل ہے اور صرف اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کے فضل ہی سے ہی یہ مشکل مرحلہ طے ہوسکتا ہے۔

عشق ومحبت کا سفر

حج کی ظاہری صورت بھی عجیب وغریب ہے اور اس میں غضب کی جاذبیت ہے، قدم قدم پر عشق ومحبت کی پُر بہار منزلیں طے ہوتی ہیں، سب سے بڑے دربار کی حاضری کا قصد ہے، دل میں دیارِ محبوب کی آرزوئیں مچلتی ہیں، سفر طویل ہے، حلال وطیب توشۂ سفر کا اہتمام کیا جارہا ہے، نیک اور صالح رفیق کی تلاش ہورہی ہے، چشم پرنم کے ساتھ عزیز واقارب سے رخصت ہورہے ہیں، لین دین کا حساب بے باق کیا جارہا ہے، حق حقوق کی معافی طلب کی جارہی ہے، کوشش یہ ہے کہ اس دربار

میں حاضر ہوں تو کسی کا معمولی حق بھی گردن پر نہ ہو، لیجئے! روانگی کا وقت آیا، غسل کر لیجئے اور دو سفید نئی چادریں پہن لیجئے، گویا انسان خود اپنے ارادہ واختیار سے سفر آخرت پر روانہ ہو رہا ہے، پہلے غسل سے بدن کے ظاہری میل کچیل کو صاف کرتا ہے اور پھر کفن کی چادریں اوڑھ کر دوگانہ احرام ادا کرتا ہے، اس طرح گویا توبہ وانابت سے دل کے میل کچیل سے اپنے باطن کو پاک صاف کرتا ہے اور ظاہری وباطنی نظافت کے ساتھ شاہی دربار میں نذرانۂ عشق ومحبت پیش کرنے کا عہد کر لیتا ہے، ارحم الراحمین نے دعوت دے کر بلایا ہے اور شاہی دربار سے بلاوا آیا ہے، یہ فوراً بیت اللہ الحرام کے شوقِ دیدار میں اس دعوت پر ''**لبیک أللّٰهم لبیک**'' (میں حاضر ہوں، اے میرے اللہ! میں حاضر ہوں) کا نعرہ بلند کرتے ہوئے مستانہ وارسوئے منزل روانہ ہوجاتا ہے۔

یہ اس والہانہ وعاشقانہ عبادت کی ابتدا ہے، زیب وزینت کے تمام مظاہر ختم، راحت وآسائش کے تمام تقاضے فراموش، نہ سر پر ٹوپی، نہ پاؤں میں ڈھب کا جوتا، نہ بدن پر ڈھنگ کا کپڑا، دیوانہ وار رواں دواں منازل عشق طے کرتا ہوا جارہا ہے، دیارِ محبوب کی دھن میں بادیہ پیمائی ہورہی ہے۔

در بیاباں ہا ز شوقِ کعبہ خواہی زد قدم
سرزنشہا گر کند خارِ مغیلاں غم مخور

(کعبہ کے شوق میں تو نے بیابانوں (جنگلوں) میں قدم رکھ دیا ہے، اگر نوکیلے کانٹوں سے تکلیف بھی پہونچے تو غم نہ کر)

پہنچتے ہی مرکز تجلیات (کعبہ) پر نظر پڑی تو بے ساختہ دارِ محبوب کا طواف کرتا ہے، بار بار چکر لگاتا ہے، حجرِ اسود کو چومتا ہے، آنکھوں سے لگاتا ہے، ملتزم سے چمٹتا ہے، زار و قطار روتا ہے، گویا زبانِ حال سے کہتا ہے:

نازم بچشمِ خود کہ روئے تو دیدہ است
رقصم بپائے خویش کہ بکویت رسیدہ است

مجھے اپنی آنکھ پر فخر ہے کہ تیرا جلال و جمال دیکھ لیا ہے، مجھے اپنے پیروں پر ناز ہے کہ وہ تیرے دیار تک پہونچ گیا ہے۔

اس بے خود عاشق زار کو جو قلبِ تپاں اور جگر سوزاں لے کر آیا تھا، پہلی مہمانی کے طور پر آبِ زمزم کا تحفۂ شیریں پیش کیا جاتا ہے، جس سے تسکین قلب بھی ہوگی اور جگر کی پیاس بھی بجھے گی اور حکم ہوتا ہے کہ جتنا پانی پیا جاسکے پی لے، خوب دل ٹھنڈا کرلے، کوئی کسر نہ چھوڑے، یہاں سے فارغ ہوکر صفا ومروہ کے درمیان چکر لگاتا ہے، پھر منیٰ پہنچتا ہے، پھر اس کے آگے عرفات کا رخ کرتا ہے، آج وادیِ عرفات سچ مچ ہنگامۂ محشر کا منظر پیش کررہی ہے، حیرت انگیز اجتماع ہے، رنگا رنگ مختلف شکلیں، مختلف زبانیں، بوقلموں مناظر، یہ سب رب العالمین کے دربارِ قدس کے مہمان ہیں، یہ شاہی دربار میں عبدیت وبندگی، ضعف وبے کسی، عجز ودرماندگی اور ذلت ومسکنت کا نذرانہ پیش کریں گے اور رضا و مغفرت، فضل واحسان اور انعام واکرام کے گوہرِ مقصود سے جھولیاں بھر کرلے جائیں گے، اپنے لیے، اپنے اعزہ واقارب اور دوست احباب کے لیے آج جو کچھ مانگیں گے نقد ملے گا، زوال ہوا تو ہر چہار طرف سے آہ وبکا کا شور برپا ہوا، اس کی آواز بھی اس حیرت انگیز طوفانِ گریہ وزاری میں ڈوب گئی، شام تک کا سارا وقت اسی عالم تحیر میں گزارتا ہے، کبھی خوب رورو کر مانگتا ہے، کبھی ''**لبیک أللھم لبیک**'' کا نعرہ لگاتا ہے، کبھی تکبیر کی گونج سے زمزمہ آراء ہوتا، کبھی تہلیل سے نغمہ سرا ہوتا ہے، کبھی ''**لا إلٰہ إلا اللّٰہ وحدہٗ لا شریک لہٗ**'' سے وحدانیت وربوبیت کی صدائیں بلند کرتا ہے، عابد ومعبود کا یہ تعلق کتنا دلربا ہے؟ اور بندگی وسرافگندگی کا یہ منظر کس قدر حیرت افزا ہے؟

آفتاب غروب ہوا اور اس ''دشت پیما'' نے بوریا بستر باندھ مزدلفہ کا رخ کیا، شب بیداری وہاں ہوگی، مغرب وعشاء کی نماز وہاں پڑھی جائے گی، اظہارِ آدابِ بندگی میں کچھ کسر باقی رہ گئی ہے تو وہاں نکالی جائے گی، کبھی رکوع وسجود ہے، کبھی وقوف وقیام ہے، کبھی تہلیل وتکبیر ہے، کبھی تسبیح وتلبیہ ہے، گریہ وزاری، دعا ومناجات اور تضرع وابتہال کا نصاب پورا ہوا تو کامیابی وکامرانی کی نعمت سے سرشار ہوکر وہاں سے منیٰ کو چلا، دشمنِ انسانیت، عدوّ مبین، راندۂ بارگاہ،

ابلیس لعین کی سر کوبی کے لیے جمرہ کی رمی کی، خلیل وذبیح (علیٰ نبینا وعلیہما الصلاۃ والسلام) کی سنتِ قربانی کی یاد تازہ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کے نام پر قربانی دی اور رضائے محبوب کے لیے جان ومال کے ایثار وقربانی کا عہد تازہ کرلیا، وہاں سے بارگاہِ قدس کے مرکز انوار کی زیارت کو چلا اور طوافِ کعبہ کے انوار وبرکات سے دیدہ ودل کی تسکین کا سامان کیا۔

الغرض اس عاشقانہ ووالہانہ عبادت میں دیوانہ وار ایثار وقربانی اور عبدیت وفنائیت کا ریکارڈ قائم کرلیتا ہے اور تجلیاتِ ربانی کے انور وبرکات سے سراپا نور بن جاتا ہے اور رحمت ورضوان کے تحفوں سے مالا مال ہوکر اور استحقاقِ جنت کی آخری سند لے کر اپنے وطن کو واپس لوٹتا ہے، اس طرح بندہ بندگی کا ثبوت دے کر جنت ورضوان الٰہی کی نعمتوں سے سرفرازی کے تمغے وصول کرلیتا ہے، ''والحج المبرور لیس لہٗ جزاء إلا الجنة'' کے آخری انعام سے مطمئن ہوجاتا ہے۔

دیکھئے! کس انداز سے عشق ومحبت کی منزلیں طے کی گئیں اور کس کس طرح سے نوازا گیا!!! یہ اس عاشقانہ وعارفانہ عبادت کا بہت ہی مختصر سا نقشہ ہے۔

سفرِ عشق میں امتحان

ظاہر ہے کہ مقصد بہت ہی اعلیٰ ہے، اس لیے کبھی کبھی اس مقصد کے حصول کے لیے امتحان بھی ناگزیر ہوتا ہے، مدتوں کے جمے ہوئے تہ در تہ زنگ وغبار کو دور کرنے کے لیے شدید تنقیہ کی ضرورت پڑتی ہے، کبھی جان پر امتحان آتا ہے، کبھی مال پر، کبھی رفقاء سے تنہا کرا کر تڑپایا جاتا ہے، کبھی پٹوا کر رُلایا جاتا ہے، کبھی ہر آسائش وراحت چھین کر آخرت کی آسائش وراحت کی نعمت سے نوازا جاتا ہے، بہر حال یہ راز سربستہ کسی کے بس کی بات نہیں، شانِ ربوبیت کے کریمانہ کرشمے ہیں، شانِ صمدیت کا ظہور ہے اور ارحم الراحمین کی رحمت خفیہ کے شیون ہیں، رحمت الٰہی کا ظہور کبھی بصورتِ رحمت ہوتا ہے، کبھی بشکل زحمت، کسی کو چوں وچرا کی گنجائش نہیں، یہ وہ مقام ہے کہ عارفین جو دریائے معرفت کے غوطہ زن ہیں وہ بھی سرِ حیرت جھکا کر خاموش ہیں، صبر آزما امتحان لیا جاتا ہے، کبھی

جوع وخوف سے، کبھی انفس واموال زیر امتحان ہوتے ہیں، رضا بالقضاء کے لیے مجاہدہ کرایا جاتا ہے اور مہربانی اور شاباشی کی بارش ہوتی اور آخر میں جنت کی سند مل جاتی ہے اور ''والحج المبرور لیس لہٗ جزاء إلا الجنة'' کا تحفہ عطا کیا جاتا ہے، بلاشبہ عبدیت کا ظہور اور شانِ عشق ومحبت کا مظاہرہ جس طرح حج بیت اللہ الحرام میں ہوتا ہے کسی اور عبادت میں نہیں ہوتا۔

اس موقع پر بے حد ہجوم ہوتا ہے، خدا کی مخلوق زیادہ پہنچ جاتی ہے، محدود مقامات اور محدود انتظامات میں غیر محدود مخلوق کا انتظام درہم برہم ہوجاتا ہے، قیام وطعام کی دشواریاں، ٹریفک اور مواصلات کا نظام تقریباً بس سے باہر، سڑکیں بند، راستے مشغول، اگرچہ قدم قدم پر حق تعالیٰ کی شانِ ربوبیت کرم فرما ہوتی ہے، لیکن پھر بھی حکومتِ وقت کنٹرول کی پوری کوشش کرتی ہے۔

اس سلسلہ میں چند باتیں اور گزارشات ضروری خیال کرتا ہوں۔

حجاج کی لیے چند ضروری ہدایات

۱ — عورتوں اور مردوں کا ناگفتہ بہ اختلاط طوافوں میں، نمازوں میں اور سلام کی حاضری میں غیر شرعی ہے، اس لیے ضروری ہے کہ عورتوں کے طواف کے لیے رات یا دن میں کوئی وقت مخصوص کرلیا جائے اور اس طرح سلام کی حاضری کے لیے بھی وقت مخصوص ہو، ان اوقات میں مردوں کو طواف یا حاضری سے روکا جائے۔

۲ — نہ تو عورتوں پر جماعت کی پابندی ہے، نہ مسجد کی حاضری کی فضلیت ہے، نہ نماز جمعہ ان پر فرض ہے، اس لیے عورتیں گھر میں نماز پڑھا کریں اور اسی طرح جمعہ میں عورتوں کی حاضری روکی جائے، موجودہ صورت حال نہ شرعاً درست ہے، نہ عقلاً قابل برداشت ہے۔

۳ — رمی جمرات کے لیے عورتیں رات کو جایا کریں جس طرح بوڑھوں اور مریضوں کے لیے بھی یہی وقت مناسب ہے، بلاشبہ بغیر عذر کے یہ خلافِ سنت ہے، لیکن موجودہ صورت حال میں ان شاء اللہ کراہت بھی ختم ہوجائے گی۔

۴– تمام حضرات جو حج بیت اللہ الحرام کا ارادہ کریں تمام ضروری مسائل یاد کر کے آئیں، فرائض وواجبات کا اہتمام بہت ضروری ہے، بسا اوقات یہ دیکھا گیا کہ لوگ فرائض وواجبات میں تقصیر کرتے ہیں اور فضائل ومستحبات کا اہتمام ہوتا ہے، اس وقت جو صورتِ حال ہے قانونی وفقہی احکام کے پیش نظر تو یہ امید رکھنا بہت مشکل ہے کہ یہ عبادت صحیح ادا ہوئی یا یہ حج مبرور ہوگا، صحیح طواف کیسے ہو؟ اور اس میں کیا کیا باریکیاں ہیں؟ اگر ایک قدم طواف کا ایسا ادا ہو کہ بیت اللہ کی طرف سینہ ہو جائے تو سارا طواف بیکار ہو گیا، اگر شروع کرنے میں حجر اسود سے تقدم ہو گیا تو طواف میں نقصان آجاتا ہے، اگر ایک انچ ہٹ کر طواف شروع کیا تو سرے سے طواف ہوا ہی نہیں، خاص کر ازدہام وہجوم میں صحیح طواف کرنا بے حد دشوار مرحلہ ہے، عورتیں مردوں کے درمیان کھڑی ہوجاتی ہیں، ایک عورت اگر صف میں مردوں کے درمیان کھڑی ہو گئی تو تین مردوں کی نماز غارت ہو گئی، جو شخص دائیں ہو جو بائیں ہو، جو اس سیدھ میں پیچھے ہو، اگر ایک ہزار عورتیں اس طرح صفوں کے درمیان ہیں تو تین ہزار مردوں کی نماز فاسد ہو گئی۔

دورانِ سفر بہت سی نمازیں قضا ہو جاتی ہیں، اگر فرض نماز قضا ہو گئی تو حج مبرور کی توقع رکھنا مشکل ہے۔

الغرض اس طرح دسیوں مسائل ہیں کہ جن سے عوام تو کیا علماء بھی غافل ہیں، رمی جمرات میں تو معمولی عذر پر دوسروں کو وکیل بنایا جاتا ہے، اس طرح وہ توکیل صحیح نہیں ہوتی، دم لازم آجاتا ہے، غور کرنے سے محسوس ہوا کہ جہاں تک مسائل واحکام کا تعلق ہے مشکل سے یہ کہا جائے گا کہ یہ حج صحیح ادا ہو گیا، لیکن حق تعالیٰ شانہٗ کی رحمت کاملہ کے پیش نظر کوئی بعید نہیں کہ اگر نیت صحیح ہو اور جذبہ سچا ہو تو تمام کوتاہیاں اور قانونی فروگزاشتیں سب معاف ہوں اور ارحم الراحمین کی رحمت عامہ سے یہی امید ہے کہ اپنے گنہگار بندوں کی کوتاہیوں سے درگزر فرما کر اپنی رحمت ونعمت سے نوازے اور نہ معلوم کس کی کون سی ادا قبول ہو جائے اور کیا کچھ خزانہ رحمت سے ملے اور بلا شبہ حق تعالیٰ شانہٗ کی رحمت کاملہ کی موسلا دھار بارش میں کوئی بدنصیب ہی محروم رہے گا، ہوسکتا ہے کہ چند

مقبولینِ بارگاہ کے طفیل سب کا حج قبول ہو، اس کی شان کریمی کے سامنے سب کچھ آسان ہے۔

کاش! اگر حق تعالیٰ کی اتنی مخلوق قانون کے مطابق جذباتِ صادقہ سے والہانہ انداز سے یہ فریضہ ادا کرتی تو امت کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا اور تمام عالم میں ان نمائندگانِ بارگاہِ قدس کا فیض جاری ہوتا۔

بہر حال کہنا یہ ہے کہ کوشش کی جائے کہ قانون کی رو سے بھی صحیح حج ہو اور نیت وجذبہ بھی سچا ہو اور قدم قدم پر تقصیر کا احساس ہو اور یہ تصور مستمر قائم ہو کہ اس حریمِ قدس میں حاضری کے آداب کی اہلیت کہاں؟ ہم جیسے ناپاکوں کو اس سرزمین میں حاضری کی دعوت دی گئی اور پہنچ گئے، یہ محض حق تعالیٰ شانہٗ کا عظیم احسان ہے کہ اس مقدس زمین اور بقعۂ نور میں سراپا ظلمات والے کو جگہ عطا فرمادی۔

توقع ہے کہ اس احساس سے بارگاہِ قدس میں شرف قبولیت نصیب ہو۔

یہ جو کچھ بیت اللہ کی عظمت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے یہ بہت سطحی حقائق کے درجہ میں بات عرض کی گئی، ورنہ جو حقائق واسرار عارفین وکبار صوفیاء کرام: شیخ اکبرؒ، امام ربانی شیخ احمد سرہندیؒ، حضرت شیخ سید آدم بنوریؒ، شاہ عبدالعزیزؒ اور حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہم اللہ جمیعًا نے بیان فرمائے ہیں وہ دائرہ بیان سے بالاتر ہیں۔

راقم الحروف نے اپنے رسالہ ’’بغیۃ الأریب فی مسائل القبلۃ والمحاریب‘‘ کے آخر میں کچھ تھوڑا سا حصہ بیان کیا ہے، بہر حال کعبۃ اللہ اس مادی کائنات میں شعائر اللہ میں داخل ہے، نماز میں اگر حق تعالیٰ شانہٗ سے مناجات وہم کلامی کا شرف حاصل ہوتا ہے تو حج میں حق تعالیٰ کے گھر میں مہمانی کا شرف ومجد حاصل ہے، جب ہم کلامی کی عظمت بیت الحرام میں نصیب ہو اور دونوں عظمتیں جمع ہو جائیں تو جو کچھ بھی اس کا درجہ ہوگا تصور وخیال سے بالاتر ہے۔

یہ وہ مقام ہے کہ انتہائی تعظیم وادب کی ضرورت ہے، لیکن آج کل ہماری غفلت وجہالت سے جو صورت حال ہے وہ ظاہر ہے۔

افسوس یہ ہے کہ ہماری تمام عبادات کی صرف صورت رہ گئی روح نکل گئی ہے، تمام عبادات بے جان لاشے ہیں، اگر ان میں جان ہوتی تو آج امت محمدیہ کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔

حق تعالیٰ کی رحمت ہے اور اسلام کا حکیمانہ نظام ہے کہ مساجد بھی بیوت اللہ ہیں، آخری سب سے بڑا مرکزی گھر وہ مسجد حرام وہ بیت الحرام ہے، جس سے عالم میں بجز اس مقام کے جہاں حضرت سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم آرام فرمارہے ہیں کوئی مقدس قطعہ نہیں، جہاں پر حق تعالیٰ کی طرف سے انوار کی موسلا دھار بارش برستی ہے، فرشتے طواف کے لیے آسمانوں سے اترتے ہیں۔

حق تعالیٰ مسلمانوں اور حجاج کرام کو توفیق نصیب فرمائے کہ اس مقام کی صحیح معرفت نصیب ہو، بقدر طاقت بشری حق ادا کرسکیں۔ ☆☆☆

انتقال پُرملال

جامعہ مظاہر علوم سہارنپور کے سرپرست محترم، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی نوراللہ مرقدہ کے صاحبزادے حضرت اقدس پیر جی مولانا محمد طلحہ صاحب کاندھلوی کی اہلیہ محترمہ، قطب الاولیاء حضرت جی مفتی محمد افتخار الحسن صاحب کاندھلوی مدظلہ العالی کی صاحبزادی کا ۳؍شوال المکرم ۱۴۳۹ھ مطابق ۱۸؍جون ۲۰۱۸ء بروز دوشنبہ دوپہر ساڑھے بارہ بجے طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا، انا للہ وانا الیہ راجعون. جس سے حضرت کے متعلقین و منتسبین اور خصوصاً جامعہ مظاہر علوم سہارنپور کے وابستگان کو گہرا صدمہ پہنچا۔

مرحومہ ہمیشہ صوم وصلوٰۃ کی پابند اور علمی انہماک کے ساتھ زندگی بسر کرنے والی بڑی نیک سیرت خاتون تھیں، ان کی نماز جنازہ ان کے آبائی وطن قصبہ کاندھلہ کی عیدگاہ میں ادا کی گئی، عیدگاہ میں واقع قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔

تمام قارئین کرام سے دعائے مغفرت وایصال ثواب کی درخواست ہے۔

قرآنی اعجاز کا ایک پہلو

یعنی قرآن کی حفاظت واقعات کی روشنی میں

مولانا عتیق الرحمن اعظمی جنوبی افریقہ

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: شہر رمضان الذی انزل فیہ القرآن۔ (البقرہ: ۱۸۵)

ماہ رمضان جس میں قرآن نازل ہوا۔

علامہ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں: اُنزلَ أشرفُ الکُتب باَشرف اللُّغات علی اَشرف الرُّسل بسَفارتِ أَشرفِ الملائکۃِ وکان ذلک فی أشرفِ بِقاعِ الأَرض واُبتدئ انزالُہ فی أشرفِ شھورِ السَّنۃ وھو رمضان فکمُل من کلِّ الوجوہ۔ (ابن کثیر: سورہ یوسف: ۲)

یعنی قرآن میں شرافت کی سب جہتیں جمع ہوگئی ہیں: کتاب بہترین، زبان سب سے اشرف عربی، رسول سب سے اشرف نبی آخرالزماں، بیچ میں واسطہ سب سے اشرف فرشتہ جبرئیل، نزول کی ابتداء ہوئی سب سے بہترین زمین کے ٹکڑے مکہ مکرمہ میں اور بہترین ماہ رمضان میں ـــــ لیلۃ القدر میں، قرآن کریم لوح محفوظ سے آسمانِ دنیا پر اتارا گیا پھر بتدریج ۲۳ سال میں پیغمبر پر اترا، نیز اسی شب میں پیغمبر پر اس کے نزول کی ابتداء ہوئی۔ (فوائد علامہ عثمانیؒ: سورۃ الدخان والقدر)

خلیفہ ہارون رشید کے دربار میں چار سال کا ایک بچہ لایا گیا جس نے قرآن مجید پڑھ لیا تھا، مسائل شرعی سے بھی واقف تھا؛ مگر جب بھوکا ہوتا تو بچوں کی طرح روتا یعنی بچوں کا خاصہ موجود تھا۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ جب حج کے لیے تشریف لے جارہے تھے تو سمندر میں جہاز پر رمضان شریف کا چاند نظر آ گیا، رفقا کی خواہش ہوئی کہ تراویح پڑھی جائے؛ مگر کوئی حافظ نہیں تھا لوگوں کے اصرار پر ایک پارہ روزانہ دن میں حفظ کرتے اور رات کو تراویح میں سنا دیا کرتے؛ اس طرح پورا قرآن (ایک ماہ میں) یاد کر کے سنا دیا۔ (اسلاف کے حیرت انگیز کارنامے ۲۰۷)

شیخ الحدیث حضرت مولانا سلیم اللہ خاں صاحبؒ خلیفۂ حضرت مولانا مسیح اللہ خاں صاحبؒ و بانی جامعہ فاروقیہ کراچی روزانہ ایک پارہ دن میں یاد کرتے اور رات کو تراویح میں سنا دیتے، ۲۷ یا ۲۹ دنوں میں پورا قرآن حفظ کرلیا۔(ملفوظات فقیہ الامت ۱/ ۸۵ و ماہنامہ الخیر ص ۲۴، صفر ۱۴۲۶ھ)

حضرت مفتی رشید احمد لدھیانویؒ کو ان کے بچوں کے حفظ کی تکمیل پر خیال آیا کہ بچوں کو حافظ بنا کر اپنے لیے اور اپنے اہلیہ کے لیے تاج کی فضیلت کا انتظام کرلیا؛ لیکن اپنے والدین کے لیے کچھ نہیں کیا؛ چنانچہ اپنی مصروفیات کے باوجود تقریباً تین ماہ کی مدت میں قرآن کریم حفظ کرلیا اس وقت حضرت مفتی صاحب کی عمر چھیالیس سال تھی۔(انوار الرشید ۲۳۵ و الخیر شمارہ صفر ۱۴۲۶ھ)

ایک سات سالہ بچہ نے پانچ ماہ سے کم مدت میں قرآن حفظ کرلیا، احمد پور شرقیہ ضلع بھاول پور کے ایک دینی ادارہ جامعۃ الحنیف الاسلامیہ کے سات سالہ طالب علم محمد ساجد (پیدائش ۲۸؍ دسمبر ۱۹۹۶ء) نے ایک اگست ۲۰۰۳ء کو نورانی قاعدہ سے اپنی تعلیم شروع کی اور ۱۸؍ جنوری ۲۰۰۴ء کو قرآن کریم مکمل حفظ کرلیا، اس دوران ۲۸ یوم کی تعطیلات ہوئیں، اس حساب سے بچے کی تدریسی مدت چار ماہ ۲۳ دن بنتی ہے۔(ماہنامہ الخیر ص ۴، شمارہ ربیع الثانی ۱۴۲۵ھ)

حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ میرا خود دیکھا ہوا ہے جس زمانہ میں میرا قیام مدرسہ راندیر یہ رنگون میں تھا تو ہندوستان سے ایک شخص رنگون آیا اس کے ساتھ اس کی لڑکی بھی تھی جس کی عمر چار سال سے زیادہ نہ تھی، اس نے کہا یہ لڑکی حافظۂ قرآن ہے اور بغیر پڑھے پڑھائے پیدائشی حافظہ ہے، آپ جہاں سے چاہیں ایک آیت پڑھ دیں یہ اس سے آگے دس بارہ آیتیں پڑھ دے گی؛ چنانچہ رنگون میں بہت سے مقامات پر اس کا امتحان لیا گیا جیسا کہا تھا ویسا دیکھا گیا، رنگون کے لوگوں نے اس لڑکی کو بہت انعام دیا، اس کے باپ کی آمدنی اسی لڑکی کے اس کمال ہی سے تھی، میں نے اس سے کہا کہ اسے آمدنی کا ذریعہ نہ بناؤ مجھے اندیشہ ہے کہ اس طرح یہ لڑکی زیادہ نہ جیے گی؛ چنانچہ میرا خیال صحیح نکلا، اگلے سال میں نے سن لیا کہ اس بچی کا انتقال ہو گیا ہے۔(الخیر ص ۶، ربیع الثانی ۱۴۲۵ھ بحوالہ اشرف البیان فی معجزات القرآن للشیخ ظفر احمد عثمانی)

شاہ اسماعیل شہیدؒ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ جب آدمی قرآن پاک کی تلاوت بکثرت کرتا رہتا ہے تو اس کا جلد پڑھنا آسان ہوجاتا ہے حتیٰ کہ گھنٹہ سوا گھنٹہ میں قرآن شریف پورا کرلیتا ہے، کہا کچھ اس انداز سے جس سے سامعین یہ سمجھے کہ خود بھی اس پر قادر ہیں، اس لیے آپ سے اتنی دیر میں ختم کردینے کی درخواست کی آپ نے دہلی میں جمنا کے کنارہ پر عصر بعد کا وعدہ فرمایا حسب وعدہ وقت مقررہ پر لوگ جمع ہوگئے تو پڑھنا شروع کیا اور مغرب سے پہلے ہی پورا کلام پاک ختم کردیا۔ (ملفوظات فقیہ الامت ۳ / ۱۱۴ و حکایاتِ اولیاء (معنی) ص ۶۷ حکایت نمبر ۵۳)

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں: بندہ نے جب یہ رسالہ (فضائل رمضان) لکھا تھا اس وقت میں نے اپنے دوستوں سے (رمضان میں ان کے قرآن پاک پڑھنے کے معمولات لکھنے کی) فرمائش کی تھی تو متعدد کے جوابات (پورے رمضان المبارک میں) ساٹھ (۶۰) سے لے کر پینسٹھ (۶۵) (تک پڑھنے) کے آئے تھے، جن میں ایک عزیز مولانا انعام الحسن بھی تھے اور میرے والد صاحبؒ تو قرآن پاک حفظ کرنے کے بعد سے چھ ماہ تک ایک قرآن پاک روزانہ پڑھا کرتے تھے۔۔۔محمد زکریا عفی عنہ ۱۷؍رمضان المبارک ۱۳۸۷ھ۔

(کتب فضائل پر اشکالات اور ان کے جوابات ص ۱۹۳ از مولانا محمد شاہد سہارنپوری مدظلہ)

حضرت مولانا انعام الحسنؒ کے لڑکے مولانا زبیر الحسن صاحب نے سہارنپور قرآن سنایا، ۲۹؍رمضان میں دہلی گئے، مولانا عشا کے بعد پہنچے، حضرت مولانا انعام الحسن نے فرمایا کیا ارادہ ہے؟ کہا جو آپ فرمائیں، فرمایا: چلو مصلے پر؛ چنانچہ مولانا زبیر الحسن صاحب مصلے پر پہنچے اور صبح سحری کے قریب تک پورا قرآن پاک پورا کرکے مصلے سے ہٹے۔ (ملفوظات فقیہ الامت ۳ / ۲۷۴)

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں: میری دادی صاحبہ نور اللہ مرقدہا حافظہ تھیں اور بہت اچھا یاد تھا، سال بھر کا معمول خانگی مشاغل کھانے پکانے کے علاوہ ایک منزل روزانہ کا تھا اور رمضان میں چالیس پارے روزانہ کا۔ (آپ بیتی ۱ / ۹۵ طبع جدید سہارنپور)

حضرت فقیہ الامت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ نے ایک طالب علم سے پوچھا جو قرآن

پاک حفظ کرتے تھے کہ کتنا پارہ سناتے ہو؟ انھوں نے بتایا کہ آدھا پارہ، اس پر فرمایا کہ میں نے مدت دراز تک نصف قرآن ہر روز نمازمیں پڑھا اور رمضان میں ہمیشہ ہر روز ایک قرآن پورا کرنے کا معمول ہے۔(ملفوظات فقیہ الامت ۳/ ۲۴۲)

علی متقی الہندی صاحب کنز العمال نے پورا قرآن ایک صفحہ پر لکھ دیا ہر سطر چوتھائی پارہ کی تھی جو ایک عجوبۂ روزگار تھی۔(نزہۃ الخواطر ۴/ ۲۱۶)

شیخ جنید حصاری تین دن میں پورا قرآن مع اعراب لکھ لیا کرتے تھے اور یہ کام درس وتدریس کے بعد فرصت کے وقت کیا کرتے تھے۔(الخیر ایضاً)

تفسیر حدائق ذات بہجۃ علامہ ابو یوسف عبد السلام قزوینی (م ۴۸۳ھ) کی ہے تین سو جلدوں میں ہے، بعض نے کہا پانچ سو یا سات سو جلدوں میں ہے، غرائب وعجائب کا مجموعہ ہے، آیت و اتَّبعوا ماتَتلوا الشَّیاطینُ علی مُلکِ سُلَیمان (بقرہ: ۱۰۲) کی تفسیر میں پوری ایک جلد ہے۔(یتیمۃ البیان لمشکلات القرآن علامہ بنوریؒ ص ۱۷)

محمد ابن جریر طبریؒ نے ۳۰ ہزار ورق میں تفسیر لکھی تھی پھر اس کا اختصار کر کے ۳ ہزار ورق میں لکھی جو اس وقت ۳۰ جلدوں میں پائی جاتی ہے، اندازہ یہ ہے کہ اصل تفسیر ۳ سو جلدوں میں ہوگی، ابوبکر ابن العربی نے ۸۰ ہزار ورق میں تفسیر لکھی، ابو عبد اللہ المقدسی الحنفی نے ۵۰ یا ۸۰ یا ۹۹ جلدوں میں لکھی (مختلف اقوال ہیں)، ابوبکر محمد الانصاری النقاش نے ۱۲ ہزار ورق میں تفسیر لکھی۔(اس تفسیر اور دیگر تفاسیر کے لیے دیکھیے یتیمۃ البیان ص ۱۷–۱۸)

امام قرطبی نے سند متصل کے ساتھ ایک واقعہ لکھا ہے کہ امیر المومنین مامون کی عادت تھی کہ کبھی کبھی اس کے دربار میں علمی مسائل پر بحث ومباحثے اور مذاکرے ہوتے تھے جس میں ہر اہل علم کو آنے کی اجازت تھی، ایک مذاکرہ میں ایک یہودی بھی آ گیا جو شکل اور لباس وغیرہ کے اعتبار سے بھی ایک ممتاز آدمی معلوم ہوتا تھا، پھر گفتگو کی تو وہ بھی فصیح وبلیغ اور عاقلانہ گفتگو تھی، جب مجلس ختم ہوگئی تو مامون نے اس کو بلا کر پوچھا کہ تم اسرائیلی ہو؟ اس نے اقرار کیا، مامون نے کہا اگر تم مسلمان ہو جاؤ تو ہم تمہارے ساتھ بہت اچھا سلوک کریں

گے، اس نے جواب دیا میں تو اپنے اور اپنے آبا و اجداد کے دین کو نہیں چھوڑتا، بات ختم ہوگئی، یہ شخص چلا گیا، پھر ایک سال کے بعد یہی شخص مسلمان ہو کر آیا اور مجلس مذاکرہ میں فقہ اسلامی کے موضوع پر بہترین تقریر اور عمدہ تحقیقات پیش کیں، مجلس ختم ہونے کے بعد مامون نے اس کو بلا کر کہا کہ تم وہی شخص ہو جو سال گزشتہ آئے تھے؟ جواب دیا، ہاں وہی ہوں، مامون نے پوچھا اس وقت تو تم نے اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا پھر اب مسلمان ہونے کا سبب کیا ہوا؟ اس نے کہا میں یہاں سے لوٹا تو میں نے موجودہ مذاہب کی تحقیق کرنے کا ارادہ کیا، میں ایک خطاط اور خوشنویس آدمی ہوں، کتابیں لکھ کر فروخت کرتا ہوں، میں نے امتحان کے لیے تورات کے تین نسخے کتابت کیے جن میں بہت جگہ اپنی طرف سے کمی بیشی کر دی اور یہ نسخے لے کر میں کنیسہ میں پہونچا، یہودیوں نے بڑی رغبت سے اس کو خرید لیا، پھر اسی طرح انجیل کے تین نسخے کمی بیشی کے ساتھ کتابت کر کے نصاریٰ کے عبادت خانے میں لے گیا وہاں بھی عیسائیوں نے بڑی قدر و منزلت کے ساتھ یہ نسخے مجھ سے خرید لیے، پھر یہی کام میں نے قرآن کے ساتھ کیا اس کے بھی تین نسخے عمدہ کتابت کیے جن میں اپنی طرف سے کمی بیشی تھی ان کو لے کر جب میں فروخت کرنے کے لیے نکلا تو جس کے پاس لے گیا، اس نے دیکھا کہ صحیح بھی ہے یا نہیں؟ جب کمی بیشی نظر آئی تو اس نے مجھے واپس کر دیا، اس واقعہ سے میں نے یہ سبق لیا کہ یہ کتاب محفوظ ہے؛ اس لیے میں مسلمان ہو گیا۔ (معارف القرآن ۵ / ۲۸۲)

علامہ طنطاویؒ نے اپنی تفسیر ''الجواہر فی تفسیر القرآن'' میں اپنے دوست کا ایک واقعہ نقل کیا ہے ان کے دوست نے فرمایا کہ میں جرمنی میں تھا، وہاں کے چند عربی علوم سے دلچسپی رکھنے والے فضلاء کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا ان میں سے ایک نے پوچھا کیا تم بھی عام مسلمانوں کی طرح قرآن کے بارے میں یہ خیال رکھتے ہو کہ قرآن عربیت وفصاحت وبلاغت کے لحاظ سے معجزہ ہے؟ میں نے کہا ہاں میں ایمان رکھتا ہوں اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ یہ تو ایک علمی مسئلہ ہے اس کا امتحان ابھی ہوسکتا ہے میں ایک بات کہتا ہوں آپ اس کو فصیح عربی میں ادا کریں، وہ یہ ہے: جہنم بے حد وسیع ہے، ان سب نے مل کر ۱۵–۲۰ جملے بنائے مثلاً ان جهنم لوسیعة، ان جهنم لاوسع مما تظنون، ان سعة جهنم لا یتصورها عقل انسان، کل ما خطر ببالک فی سعة جهنم فانها لارحب منه واوسع وغیرہ، میں نے کہا اور محنت کیجیے، انھوں نے کہا ہم اپنی

محنت اور فکر ختم کر چکے، میں نے کہا قرآن نے جو بیان کیا ہے اس کو سنیے: یوم نقول لجھنم ھل امتلئت وتقول ھل من مزید (ق: ۳۰) چونکہ وہ عربی داں تھے، اچھل پڑے اور اپنی رانوں پر ہاتھ دے مار کر اقرار کیا کہ ہم عاجز رہے۔ (تفسیر الجواہر للطنطاوی ۲۳/ ۱۰۷)

ہارون رشید کے پاس ایک نصرانی طبیب علاج کے لیے رہتا، تھا اس نے علی بن حسین بن واقد سے کہا کہ تمہاری کتاب قرآن میں علم طب کا کوئی حصہ نہیں ہے؛ حالانکہ دنیا میں دو ہی علم ہیں ایک علم ادیان دوسرا علم ابدان جس کا نام طب ہے، علی بن حسین نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے سارے فن طب اور حکمت کو آدھی آیت میں جمع کر دیا ہے، وہ ہے کُلوا واشرَبوا ولاتُسرِفُوا (اعراف: ۳۱) پھر اس نے پوچھا کیا تمہارے رسول کے کلام میں بھی طب کے متعلق کچھ ہے، انھوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چند کلمات میں سارے فن طب کو جمع کر دیا، فرمایا: المِعدةُ بیت الدّاء والحمیةُ رأسُ الدواء واَعطِ کلَّ بدن ما عوَّدتَه، معدہ بیماریوں کا گھر ہے، مضر چیزوں سے پرہیز ہر دوا کی اصل ہے، ہر بدن کو وہ چیز دو جس کا وہ عادی ہے، نصرانی طبیب نے سن کر کہا کہ تمہاری کتاب اور تمہارے رسول نے جالینوس کے لیے کوئی طب نہیں چھوڑی۔ (معارف القرآن ۳/ ۵۴۷)

ملیشیا میں منعقد ہونے والی کتابوں کی نمائش میں پانچ سو (۵۰۰) سالہ قدیم ایک میٹر لمبا نسخہ قرآنی متعارف کرایا گیا، نیز ایک نصف میٹر لمبا کھجور کے پتوں پر قلم بند قرآنی نسخہ بھی دکھایا گیا، یہ قرآن کی عظمت اور مسلمانوں کی اس کتاب کے ساتھ وابستگی کا واضح ثبوت ہے۔ (الفاروق کراچی، ص ۲۹، رجب ۱۴۲۸ھ)

ایسے بے شمار واقعات تاریخ میں ملیں گے، ان واقعات سے قرآن کی حقانیت نیز دین متین کی حقانیت اور اس کی حفاظت روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے، اسی طرح کے واقعات محدثین عظام، فقہاء کرام اور دیگر علماءِ اسلام کے بھی ملتے ہیں، حق فرمایا حق تعالیٰ نے: اِنَّا نَحنُ نَزَّلنَا الذِّکرَ وَاِنَّا لَهُ لَحافِظُون۔

ارباب مدارس اور خود احتسابی کی ضرورت

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

یہ ایک حقیقت ہے کہ گزشتہ ڈیڑھ تا دو سال کے عرصہ میں پورے برصغیر میں ناموافق حالات کے باوجود اسلامی افکار و اقدار کی حفاظت جس ذریعہ سے انجام پائی ہے، وہ مدارس اسلامیہ ہیں، ۱۸۵۷ء سے پہلے ہمارے ملک میں دینی تعلیم کے ادارے موجود تھے؛ لیکن یا تو وہ حکومتوں کے تحت چلتے تھے، یا بڑے نوابوں اور رؤساء اپنی ڈیوڑھیوں میں مدارس قائم کیا کرتے تھے، قوم وملت کا براہ راست اداروں سے تعلق نہیں تھا؛ اس لئے یہاں طلبہ محدود ہوتے تھے، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے صرف ایک مدرسہ قائم نہیں کیا؛ بلکہ قیام مدارس کو ایک تحریک کی شکل دی اور اس کے لئے یہ نظام قائم فرمایا کہ ان اداروں کو عوامی تعاون کے ذریعہ چلایا جائے، حکومت اور اصحاب ثروت کا محتاج نہ رکھا جائے، اس کے متعدد فائدے ہوئے، اول یہ کہ یہ ادارے حکومتوں اور سرمایہ داروں کی بے جا مداخلت سے محفوظ ہو گئے، دوسرے یہاں طلبہ صرف تعلیم ہی حاصل نہیں کرتے؛ بلکہ ان میں دینی غیرت وحمیت بھی پیدا کی جاتی ہے؛ تا کہ وہ اپنے آپ کو اسلام کا ایک ہمہ وقتی سپاہی تصور کریں، تیسرے چوں کہ یہ ادارے عوامی مدد سے چلتے ہیں؛ اس لئے عوامی جواب دہی کا احساس بھی ان کے اندر رہتا ہے، اور یہ چیز بہت سے مواقع پر ان کو انحراف اور غلط روش سے محفوظ رکھتی ہے، چوتھے عوام کا ان اداروں سے تعلق قائم رہتا ہے، اور اس کی وجہ سے عام مسلمان اپنے علماء سے مربوط رہتے ہیں، پانچویں اس تعلق کے نتیجہ میں علماء کے اندر بھی عام مسلمانوں کی فکر باقی رہتی ہے، آج جو مدارس اور مکاتب کی فکر کررہے ہیں، اصلاح معاشرہ کی تحریک چلا رہے ہیں، دارالقضاء کا نظام قائم کررہے ہیں، دیہاتوں میں مسجدیں تعمیر کرا رہے ہیں، حسب موقع خدمت خلق کے کام بھی کرتے ہیں، یہ سب

اسی فکرمندی کا نتیجہ ہے۔

مدارس کے معاملے میں آج کل افراط وتفریط کا پہلو اختیار کیا جاتا ہے، ایک طرف وہ لوگ ہیں، جو مدارس کو نشانہ بناتے ہیں؛ بلکہ لوگوں کا ذہن بناتے ہیں کہ مدارس کو تعاون نہ دیا جائے، یہ دانستہ یا نادانستہ ایک اہم ترین اسلامی کاز کو نقصان پہنچا رہے ہیں، دوسری طرف وہ اہل مدارس ہیں جو اپنے سلف صالحین کے روش سے ہٹ چکے ہیں، اورانہوں نے مدارس کو بعض عوام کی زبان میں تجارت بنالیا ہے، جہاں اصحاب خیر کو مدارس کی اہمیت اورافادیت کو سمجھنے کی ضرورت ہے، وہیں مدارس کو بھی خود اپنا احتساب کرنے کی ضرورت ہے، اگرارباب مدارس نے اس طرف توجہ نہیں دی تو جو حال وسط ایشیا کے ملکوں میں کمیونسٹ تحریک کے غلبہ سے پہلے علماء و مشائخ اور تعلیم گاہوں اور خانقاہوں کا ہوا یہاں تک کہ عام مسلمان اتنے بدگمان ہو گئے کہ انہوں نے اپنے ہاتھوں سے اپنے علماء ومشائخ کو تہہ تیغ کیا، ہزار بار خدانخواستہ کہیں ہمارے ملکوں میں بھی عوام کے اندر علماء سے اسی طرح کی نفرت پیدا نہ جائے۔

اس لئے اس سلسلے میں چند بنیادی باتیں عرض کی جاتی ہیں:

۱— اس وقت جو نئے مدارس قائم کئے جا رہے ہیں، شاید مبالغہ نہ ہو کہ ان میں ۷۵رفیصد بلا ضرورت ہیں، اورکسی خاص مقصد کے تحت قائم نہیں کئے جارہے ہیں، شہر کے ایک ہی محلہ میں کئی کئی مدارس، ایک ہی گلی میں کئی کئی ادارے؛ حالاں کہ صورت حال یہ ہے کہ محلہ کے ایک دوسرے میں اگر تمام مدارس کے طلبہ کو جمع کر دیا جائے، تب جا کر وہ ایک چھوٹا موٹا مدرسہ کہلانے کا مستحق ہوگا، مدارس کی یہ بے وجہ کثرت زیادہ سے زیادہ اساتذہ، منتظمین اورعملہ کی تنخواہوں کا بوجھ امت کے کاندھوں پر ڈالتا ہے، بعض جگہ تو جتنے بھائی ہیں، ہر بھائی کا الگ الگ مدرسہ ہے، اوراب لڑکیوں کی تعلیم گاہوں میں بھی یہی نوبت آرہی ہے کہ ہر بہن اور ہر بھاوج کے الگ الگ مدرسے ہیں۔

۲— یہ بات بھی دیکھی جاتی ہے کہ مدرسہ میں زکوٰۃ کا مصرف نہیں ہے، چند بچوں کی آمدورفت

ہے؛ لیکن زکوٰۃ کا جواز پیدا کرنے کے لئے کہیں دور دراز سے آٹھ دس بچے لے آئے، دارالاقامہ قائم کرلیا کہ اب کوئی اعتراض نہ ہو اور ان بچوں کا سہارا لے کر زکوٰۃ وصول کرنے کی کوشش جاری رکھی جائے؛ حالاں کہ جس مرحلے کی تعلیم کے لئے دور دراز کے بچوں کو لایا جا رہا ہے، وہاں اس مرحلے کی تعلیم کے بہت سارے ادارے موجود ہیں، داخلہ کی گنجائش بھی ہے اور مدرسہ کو طلبہ کی ضرورت بھی؛ لیکن سرپرستوں کو بہلا پھسلا کر بچے لائے جاتے ہیں، یہاں تک معلوم ہوا کہ لانے والے حضرات ایک طرف مدرسہ کے مہتمم سے پیسے وصول کرتے ہیں، اور دوسری طرف بچوں کے غریب سرپرستوں سے، اب چائلڈ لیبر قانون اتنا سخت ہو گیا ہے کہ بعض دفعہ بچے پکڑے بھی جاتے ہیں، اور رشوت دے کر انہیں چھڑایا جاتا ہے، کیا اللہ تعالیٰ نے اس انداز پر مدارس قائم کرنے کا حکم دیا ہے، اور یہ ثواب کا عمل ہے یا عنداللہ جواب دہی میں اضافہ کا سبب؟

۳— خلاف واقعہ بات کہنے کو جھوٹ کہتے ہیں، اور دوسروں کو خلاف واقعہ باتوں کا یقین دلایا جائے، یہ دھوکہ ہے، جب غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے دوسرے کو کوئی خاص بات باور کرائی جائے تو اس میں جھوٹ اور دھوکہ دونوں کی شمولیت ہو جاتی ہے، کس قدر افسوس کی بات ہے کہ مدارس کے تعارف میں شاید جھوٹ کو برا نہیں سمجھا جاتا؛ اس لئے طلبہ اور فارغین کی تعداد میں بڑے ہی مبالغے سے کام لیا جاتا ہے، بعض حضرات نے مدرسوں کا براہ راست جائزہ لیا تو ذمہ داروں نے قرب وجوار کے دوسرے مدارس کے طلبہ کو بھی اپنے یہاں جمع کرلیا؛ تاکہ زیادہ تعداد کا یقین دلایا جاسکے، اور اپنی غلط بیانی پر پردہ ڈالا جاسکے، اگر کسی شخص نے جھوٹ پر مبنی تعارف ایک ہزار کی تعداد میں شائع کیا اور اسے ایک ہزار لوگوں تک پہنچایا تو گویا اس نے ایک ہزار بار جھوٹ بولنے اور دھوکہ دینے کا ارتکاب کیا ہے، اگر مدارس کے ذمہ داران کا یہ کردار ہو تو بے دین نظر آنے والے لوگوں کا کیا شکوہ کیا جائے، جھوٹ کی انتہا تو یہ ہے کہ بعض دفعہ کمپیوٹر کے ذریعہ جعلی تصدیق نامہ تیار کرنے کی بھی خبر ملتی ہے، سفراء پکڑے جاتے ہیں، اور کبھی پولس اور کبھی عوام کے ذریعہ ان کی سرزنش بھی ہوتی ہے۔

۴— یہ جھوٹ اور دھوکہ ان مدارس میں اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے، جو سرکاری امداد حاصل کرتے ہیں، جتنی برائیاں سرکاری ملازمت کے دوسروں شعبوں میں پائی جاتی ہیں، قریب قریب وہ سب اضافہ کے ساتھ ان مدرسوں میں پائی جاتی ہیں، طلبہ کا داخلہ نہیں ہوتا؛ لیکن رجسٹر داخلہ میں ناموں کا اندراج کیا جاتا ہے، طلبہ صرف امتحان دیتے ہیں؛ لیکن ایک حاضر باش طالب علم کی حیثیت سے اس کا فارم پُر کرایا جاتا ہے، اساتذہ امتحان کے سنٹر پہنچ کر بچوں کو چوری کراتے ہیں، پھر جب کاپیاں ممتحن کے پاس جاتی ہیں تو غلط طور پر اس کے نمبرات بڑھواتے ہیں، مدرسہ میں حاضر نہیں ہوتے؛ لیکن رجسٹر حاضری پر دستخط کرتے اور تنخواہ اُٹھاتے ہیں، غرض جھوٹ اور دھوکہ کا ایک سلسلہ ہے، جو شروع سے آخر تک اس نظام کو اپنے گھیرے میں لئے ہوا ہے، پھر افسوس کی بات یہ ہے کہ اس میں رشوت لی بھی جاتی ہے اور دی بھی جاتی ہے، صلاحیت کی بناء پر نہیں رشتہ داری اور تعلق کی بناء پر اور رشوت لے کر اساتذہ وعملہ کا تقرر کیا جاتا ہے، یہ رشوت لے کر تقرر کرنے والے بھی بعض اوقات علماء ہوتے ہیں، دوسری طرف علماء رشوت دیکر اپنا تقرر کراتے ہیں، تنخواہیں حاصل کرنے کے لئے بھی رشوت دینی پڑتی ہے، طلبہ کو پاس کرانے کے لئے رشوت لی بھی جاتی ہے اور ممتحنین کو دی بھی جاتی ہے۔

مقام عبرت ہے کہ اللہ نے جن کو عالم وحافظ بنایا ہو، جن کو فقہ وفتاویٰ کی دولت سے نوازا ہو، جو دن رات اپنے مواعظ میں کسب حلال پر زور دیتے ہوں، جو رشوت کی لین دین پر حرمت کا فتویٰ دیتے ہوں، جن کو ایک عالم باعمل سمجھ کر لوگ ان کے پیچھے نماز پڑھتے ہوں، وہ اللہ کو کیا منہ دکھائیں گے؟ یہ سرکاری بورڈ کے مدارس کی عمومی صورت حال ہے؛ مگر اس میں شبہ نہیں کہ بعض مدارس یا بعض اساتذہ اور ذمہ داران ان کمزوریوں سے محفوظ بھی ہیں؛ لیکن ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے۔

۵— ایک عجیب تصور مدارس کی ملکیت کا قائم ہو گیا ہے، مدرسہ کو ملکیت سمجھا جاتا ہے، مدرسہ کی املاک مدرسہ کے نام پر خریدنے کے بجائے لوگ اپنے نام پر خرید کرتے ہیں، ایسے

متعدد واقعات پیش آچکے ہیں کہ جب ادارے کے ذمہ دار کا انتقال ہوگیا تو ان کے ورثاء نے اس میں حق وراثت کا دعویٰ کردیا،لوگ بھی اس کے اس قدر عادی ہوگئے ہیں کہ مدرسہ کا نام لینے کے بجائے وہ کہتے ہیں ''یہ فلاں صاحب کا مدرسہ ہے'' یہ نہایت افسوس ناک بات ہے؛اس لئے بعض دفعہ والد کی وفات کے بعد بیٹا لازمی طور پر اپنے آپ کو ذمہ دار سمجھتا ہے، چاہے وہ عالم تک نہ ہو، پھر یہیں سے مدرسہ پر قبضہ کے لئے بھائیوں کے درمیان اور کبھی متوفی کے بیٹوں اور داماد کے درمیان جھگڑا شروع ہوتا ہے، اگر کسی شخص کا بیٹا واقعی اپنے علم وفضل کے اعتبار سے اس ادارہ کو چلانے کا اہل ہو، مجلس انتظامی اسے ادارہ کا ذمہ دار بنادے، اور وہ ایک مالک کی حیثیت سے نہیں منتظم کی حیثیت سے اس کا نظم چلائے تو اس میں کوئی حرج نہیں؛ بلکہ بعض دفعہ انتشار سے بچنے کے لئے یہ صورت بہتر بھی ہوتی ہے، اور اسی لئے بعض بڑے مدارس میں اس کی روایت رہی ہے؛لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ منتظم ادارے کا مالک ہوگیا۔

مدارس کی اہمیت سے ہرگز ہرگز انکار نہیں کیا جاسکتا، یہ دین کے قلعے اور اسلام کی حفاظت گاہیں ہیں، یہ زکوۃ وعطیات کا بہترین مصرف ہیں، اور صدقہ جاریہ کا درجہ رکھتے ہیں؛ لیکن مدارس کے وقار کی حفاظت بھی خود ارباب مدارس کی ذمہ داری ہے، اصحاب خیر کو ان اداروں کا بھرپور تعاون کرنا چاہئے اور جیسے مذکورہ مفاسد میں مبتلا بہت سے ادارے موجود ہیں، اسی طرح ایک بہت بڑی تعداد مفید اور کارکرد مدارس کی بھی ہے، تجار اور اصحاب ثروت کو چاہئے کہ اپنے کاروبار میں تحقیق وتفتیش کے ساتھ کاموں کو انجام دیتے ہیں، اسی طرح مدارس کے بارے میں بھی تحقیق سے کام لیں، اور کھرے کھوٹے میں فرق کریں، نہ یہ درست ہے کہ مدارس کے تعاون سے ہاتھ روک لئے جائیں، اور نہ یہ مناسب ہے کہ بلا تحقیق ہر ادارے کا اس طرح تعاون کیا جائے ،جیسا بہت سے لوگ ہر گداگر کے کشکول میں روپے دو روپے ڈالتے جاتے ہیں، وما أرید إلا الإصلاح، واللہ ھو الموفق۔

ہمارا رمضان مقبول ہوا؟

عبدالحفیظ امیر پوری

رحمتوں اور مغفرتوں سے بھرا رمضان المبارک کا مہینہ ختم ہو گیا، اس کے بابرکت لمحات ہم سے رخصت ہو گئے، اس ماہ مبارک میں جنہیں رب العالمین نے توفیق عطا فرمائی، انہوں نے سارا مہینہ روزہ رکھا، راتوں میں عبادت کی، دن اور رات کی ہر گھڑی تلاوت قرآن کی، اپنے مال کو رب کی رضا کے لیے غریبوں، مسکینوں، یتیموں اور خیر کے کاموں میں لٹایا، ہلال عید دیکھ کر فطرانہ تقسیم کیا اور عید کے بعد بھی ان کی عبادت میں کوئی فرق نہیں آیا، بلکہ رمضان المبارک میں پانچوں نماز کی باقاعدہ ادائیگی کے ساتھ ساتھ، روزوں، تلاوت قرآن کریم، زکاۃ، صدقات وخیرات، اور قیام اللیل کی جو عبادتیں انہوں نے شروع کی تھیں، اس کے لیے رب العالمین سے گڑگڑا کر دعائیں مانگنے لگے کہ وہ انہیں ان عبادتوں پر استقامت عطا فرمائے اور ان نیکیوں کو اپنی بارگاہ میں شرفِ قبولیت عطا فرمائے۔ آمین

ایک بندۂ مؤمن کی یہ حالت ہوتی ہے کہ نیک اعمال کی توفیق ملنے کے بعد وہ اس پر استقامت مانگتا ہے اور دوبارہ گناہوں کی طرف جانے سے اللہ تبارک وتعالیٰ کی پناہ مانگتا ہے، چنانچہ خود اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے بندوں کو سکھلایا کہ عبادات کی توفیق ملنے کے بعد مجھ سے یوں دعا مانگا کرو!:

”اے ہمارے رب! ہمارے دلوں کو ہدایت دینے کے بعد کج روی میں نہ مبتلا کردے، اور ہمیں اپنے پاس سے رحمت عطا فرما، بے شک تو بڑا عطا کرنے والا ہے۔“ (آل عمران)

اور اپنی کی ہوئی عبادتوں پر انہیں تکبر وغرور نہیں ہوتا، حضرت سفیان ثوریؒ فرمایا کرتے تھے: ”وہ عبادت جس سے انسان غرور وتکبر میں مبتلا ہو جائے، اس سے وہ گناہ بہتر

ہے جسے کرنے کے بعد انسان کو پشیمانی لاحق ہو۔‘‘

بلکہ انہیں خوف لاحق رہتا ہے کہ مبادا یہ عبادتیں رب العالمین کے دربار میں شرف قبولیت پائی بھی ہیں یا نہیں؟ چنانچہ ان کا حال رب تعالیٰ نے اپنے کلام قرآن مجید میں یوں فرمایا: ’’اور جو اللہ کے لیے جو کچھ دیتے ہیں، اسے دیتے ہوئے ان کے دل خائف ہوتے ہیں کہ بے شک انہیں اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔‘‘ (مومنون)

اسلاف کرام کے متعلق آتا ہے کہ وہ رمضان المبارک گذرنے کے بعد چھ ماہ تک گڑ گڑا کر اللہ تعالیٰ سے رمضان میں کی ہوئی عبادتوں کی قبولیت مانگا کرتے تھے، اس لیے کہ عمل دیکھنے میں چاہے کس قدر ہی شاندار کیوں نہ ہو اگر رب کے دربار میں شرف قبولیت نہ پاسکا تو سب بیکار ہے، اصحاب رسول ﷺ کے متعلق عبدالعزیز بن ابی رواد کہتے ہیں:

’’ہم نے صحابہ کرام کو پایا کہ وہ عمل صالح کی انجام دہی میں خوب خوب کوشش کرتے جب نیکیوں سے دامن مراد بھر لیتے تو ان کے اندر یہ فکر لاحق ہوجاتی کہ آیا ان کے اعمال مقبول ٹھہرے یا رد کردیئے گئے۔‘‘

فضالہ بن عبید کہا کرتے تھے: ’’اگر میں جان لوں کہ اللہ تعالی نے ہم سے رائی کے دانہ کے برابر بھی قبول کرلیا ہے تو یہ میرے لئے دنیا و مافیھا سے بہتر ہوگا کیونکہ اللہ تعالی کا فرمان ہے: ’’**انمایتقبل اللہ من المتقین**‘‘ بیشک اللہ تعالی نیک لوگوں سے ہی قبول کرتا ہے۔

کیا اسلام نام ہے سال میں ایک مہینہ عبادت کا؟ کیا اسلام کا مطلب ہے موقع اور مناسبت سے اسے اپنالو اور بس؟ کیا اسلام فقط رمضان کے روزے اور جمعہ وعیدین کے اہتمام کا نام ہے؟ افسوس آج بعض اسلام کے ماننے والوں نے کچھ ایسا ہی سمجھ رکھا ہے۔ جس طرح عیسائی ہفتہ میں ایک دن چرچ کو جاتے ہیں، ویسے ہی کچھ فرزندان اسلام ہفتہ میں ایک دن مسجد چلے جاتے ہیں، کچھ سال میں ایک ماہ رمضان المبارک کی عبادات کر کے اللہ تبارک وتعالیٰ پر احسان کرتے ہیں۔

اسلام یہ نہیں ہے، ہم جس اللہ کی عبادت کرتے ہیں وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، اس نے ہمیں اِس دنیا میں امتحان کے لئے بھیجا ہے، یہ دنیا دار العمل ہے، آخرت کی کھیتی ہے، جب آنکھیں بند ہو جائیں گی تو ذہن کے سارے پردے کھل جائیں گے، انسان تمنا کرے گا کہ اے کاش! ہمیں کچھ نیکی کرنے کا موقع مل جاتا، ہمارے گناہ مٹا دیئے جاتے لیکن اس وقت عمل کا موقع نہیں ہوگا، موقع جا چکا ہوگا:

"حتی اذا جاء احدھم الموت قال رب ارجعونی لعلی اعمل صالحا فیما ترکت۔"

"حتی کہ جب ان میں سے کسی کو موت آئے گی تو وہ کہے گا: اے میرے رب مجھے واپس بھیج، تاکہ اس دنیا میں، جسے میں چھوڑ آیا ہوں، نیک عمل کروں۔"

موت دیکھ کر جب آنکھوں کے پردے ہٹ جائیں گے تو تمنا اِس بات کی کریں گے کہ ہمیں نیک عمل کرنے کا موقع دے دے، کیا ہی اچھی تمنا ہے۔ لیکن کیا اس وقت موقع مل جائے گا؟ مالک عرش بریں کا جواب ہوگا: ہرگز نہیں موقع جاتا رہا:

"کلا انھا کلمۃ ھو قائلھا ومن ورائھم برزخ الی یوم یبعثون۔" (المومنون)

"بیشک یہ ایک بات ہے جو وہ کہنے والا ہے، اور ان کے آگے پردہ ہے اس دن تک جب وہ دوبارہ اٹھائے جائیں گے۔"

حضرت فضیل بن عیاض ایسے لوگوں کے متعلق جو رمضان میں تو بڑھ چڑھ کر عبادت کرتے تھے اور رمضان کے بعد سستی کرتے تھے، فرمایا کرتے تھے:

"مجھے ان لوگوں پر تعجب ہے جو اپنے رب کو سوائے رمضان کے اور کسی مہینے میں نہیں پہچانتے۔" (نضرۃ النعیم)

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نور اللہ مرقدہ نے لکھا ہے:

"روزہ دو قسم کا ہوتا ہے، ایک سحر سے مغرب تک رکھا جاتا ہے، اس میں کچھ پابندیاں ہوتی ہیں جن کا بہت خیال رکھا جاتا ہے کہ روزہ مکروہ نہ ہو جائے، ٹوٹ نہ جائے، یہ

روزہ مغرب کے وقت افطار کیا جاتا ہے اور پورا ماہ روزہ رکھ کر عید منائی جاتی ہے۔

دوسرا روزہ شعور بیدار ہونے سے لے کر زندگی کے آخری دم تک کا ہے، اس کی بھی پابندیاں ہیں جن کا خیال رکھنا بے حد ضروری ہے، یہ روزہ اس دنیا میں نہیں اگلے جہاں میں حوض کوثر پر افطار کیا جائے گا اور اس کی عید جنت میں منائی جائے گی۔"

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں: "اگر دیکھنا ہو کہ کسی کی رمضان المبارک کی عبادت قبول ہوئی ہے یا نہیں؟ تو اس کے رمضان کے بعد والے اعمال دیکھو، اگر رمضان کے بعد بھی نیک اعمال پر اس کی استقامت اسی طرح باقی ہے جیسے ماہ رمضان میں تھی تو سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی رمضان میں کی جانے والی عبادتوں اور اطاعتوں کو قبول فرمالیا، جس کی وجہ سے اسے ان اعمال کو تسلسل کے ساتھ باقی رکھنے کی توفیق عطا فرمائی اور جس کو دیکھو کہ رمضان کے بعد اس کے اعمال میں یک لخت فرق آ گیا ہے، وہ راہ ہدایت سے بھٹک کر پھر اسی راہ کا راہی ہو گیا جس پر کہ وہ ماہ رمضان المبارک سے پہلے گامزن تھا، تو سمجھ لو کہ اس کا شمار بھی انہیں لوگوں میں ہے، جن کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "**كم من صائم ليس له من صيامه الا الجوع و العطش و كم من قائم ليس له من قيامه الا السهر۔**" (ابن ماجہ، احمد، دارمی) "کتنے ہی ایسے روزہ دار ہیں جن کے نصیب میں سوائے بھوک اور پیاس کے کچھ نہیں ہے، کتنے ہی ایسے رات میں قیام کرنے والے ہیں جن کے نصیب میں سوائے رات جاگنے کے کچھ نہیں۔"

طابع وناشر وایڈیٹر (مولانا) محمد سلمان (صاحب) ناظم مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور
نے سہارنپور الیکٹرک پریس سہارنپور سے چھپوا کر
دفتر ماہنامہ مظاہر علوم سہارنپور سے شائع کیا

مدارس عربیہ کے نئے تعلیمی سال کا آغاز

مولانا شمس الحق ندوی

ماہِ شوال مدارس دینیہ کے لیے نئے سال کا آغاز ہوتا ہے، دینی تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ اسی مہینہ میں داخلہ کے لیے ان مدرسوں میں آتے ہیں، والدین بھی جن کو دین کا شوق اور کچھ شعور ہوتا ہے، اپنے بچوں کو ان مدارس میں بھیجتے ہیں کہ دین کی تعلیم اور اس پر عمل کا سبق یہیں ملتا ہے۔

اس لیے اہل مدارس کی بڑی نازک ذمہ داری بنتی ہے کہ آنے والے ان طلبہ کی تعلیم وتربیت کی پوری فکر کریں اور وہ انداز وطریقہ اپنائیں جس سے ان کی صحیح تعلیم وتربیت ہوسکے، اہل مدارس کے لیے یہ شرف وخوش نصیبی کی بات ہے کہ دین کے حصول کا مرکز وہی سمجھے جاتے ہیں، لہٰذا اس شرف کا حق ادا کرنے کے لیے اپنی پوری دینی، علمی اور تربیتی صلاحیتوں سے کام لینا چاہیے کہ انسانوں کو ہدایت کی راہ دکھانے کا ان مدارس کے اور ان کے کارکنان کے علاوہ کوئی اور مرکز نہیں پایا جاتا۔

اس میں شک نہیں کہ یہ علم کے عروج وترقی کا زمانہ ہے، ہر قسم کے علم وایجادات روز بروز سامنے آرہے ہیں، جن پر عقل حیران رہ جاتی ہے، ان علوم وایجادات کے بڑے بڑے ادارے قائم ہیں، لیکن جہاں انسانی اخلاق ومحبت اور اس کائنات کے بنانے اور سجانے والے مالک کے جاننے اور پہچاننے کی تعلیم دی جاتی ہو، انسان کو اس کے مالک وخالق سے جوڑنے کا سبق سکھایا جاتا ہو، جو انسان کے پیدا کرنے کا اصل مقصد ہے اور ساری مخلوقات پر اس کو فضیلت دی گئی ہے: ”**ان الدنیا خلقت لکم وانکم خلقتم للآخرۃ**“ یعنی دنیا کی ساری چیز، سارے اسباب ووسائل انسان کے لیے پیدا کیے گئے ہیں، اور انسان آخرت

کے لیے پیدا کیا گیا ہے، دنیا کے غیر دینی علوم وفنون کی ترقی نے انسان کو اس کی پیدائش کے اصل مقصد سے غافل اور خدا فراموش بنا دیا ہے، اور وہ من مانی زندگی گذار رہا ہے، جس کے نتیجہ میں ظلم وفساد کا خوفناک اندھیرا دن بدن بڑھتا جارہا ہے۔

انسانوں کی ہدایت ورہنمائی کے روشن مینار یہ مدارس ہی ہیں، جو کارِنبوت انجام دینے کے ذمہ دار ہیں، لہٰذا اہل مدارس پر ''**العلماء ورثة الانبیاء**'' (علماء نائبین رسول ہیں) کی نازک ذمہ داری ڈالی گئی ہے، ذمہ داری جتنی نازک ہوتی ہے، اتنا ہی اس کے لیے فکر وہمت اور حکمت وسوجھ بوجھ سے کام لینے کی ضرورت ہوتی ہے، لہٰذا طلبہ کی تعلیم وتربیت کے لیے پوری کوشش کرنا، یہ اہل مدارس کی ذمہ داری ہے۔

مدارس میں آنے والے طلبہ کا الگ الگ ماحول اور صلاحیتیں ہوتی ہیں، طلبہ کی کچھ تعداد خوش حال گھرانوں کی ہوتی ہے، ان کا مزاج اور ان کی سوچ الگ ہوتی ہے، ان کی تربیت کے لیے ان کے ماحول کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے، ان کی نفسیات الگ ہوتی ہیں، دیہاتوں سے آنے والے اور متوسط گھرانوں سے آنے والے طلبہ کی تعداد زیادہ ہوتی ہے، ان کی ثقافت اور سوچ الگ ہوتی ہے، ان کی تربیت اور ذہن سازی کا الگ انداز اپنانا پڑے گا۔

بڑے اور مرکزی مدارس میں تو یہ ممکن نہیں، لیکن چھوٹے اور ملحقہ مدارس میں جہاں طلبہ کی تعداد تھوڑی ہوتی ہے، اس کا لحاظ طلبہ کی تربیت میں معاون ہوگا، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابۂ کرامؓ کی تربیت میں ان کی نفسیات اور ماحول کا پورا لحاظ فرمایا ہے، حدیث کی کتابوں میں اس کی بڑی مثالیں ملتی ہیں، امکان بھر طلبہ کے سرپرستوں سے رابطہ رکھنا بھی طلبہ کی تربیت میں تو معاون ہوگا ہی، خود ان سرپرستوں کو بھی فائدہ پہنچے گا، اس لیے کہ ان میں سے اکثر دین کی ابتدائی اور بنیادی باتوں سے ناواقف ہوتے ہیں، اس انداز کو اپنانے سے اصلاح معاشرہ کا بھی اچھا خاصا کام ہوسکتا ہے، جو بہر حال علماء ہی کی ذمہ داری ہے۔

اہل مدارس یہ نہ خیال کریں کہ غریب گھروں سے آنے والے معمولی لباس اور معمولی کھانا کھانے اور فرش پر بیٹھ کر پڑھنے والے یہ طلبہ جن کے دل بجھے ہوئے، امنگیں دبی ہوئی ہیں، دنیا کے بگڑے ہوئے طوفانی ماحول میں انسانیت ومحبت کا کیا کام انجام دے سکیں گے، یہ کسی مکتب کے استاد یا مسجد کی امامت کا کام ہی سنبھالیں گے، اول تو خود مکتب کی تعلیم یا مسجد کی امامت کوئی معمولی یا حقیر کام نہیں ہے، جس کو دین سے دور اور دنیا کمانے والے لوگوں نے سمجھ رکھا ہے، یہ مکتب نہ ہوں تو بچوں کو کلمہ سکھانے، ان کے دلوں کی سادہ تختی میں توحید کا عقیدہ بٹھانے کا کام کیسے انجام پاسکے گا، اور یہ ائمہ نہ ہوں تو مساجد کیسے آباد ہوں گی، اور روزمرہ کے ضروری مسائل مقتدیوں کو کون بتائے گا؟

اسی کے ساتھ اس سے بھی مایوس نہ ہونا چاہیے کہ انھیں غریب گھرانوں کے بچوں میں وہ لعل وگہر پوشیدہ ہیں جن سے قوموں اور ملکوں میں انقلاب لایا جاسکتا ہے، ہماری دینی ودعوتی تاریخ میں اس کی بڑی سبق آموز مثالیں موجود ہیں، ان کے نام گنائے جاسکتے ہیں، لیکن ہم نے نام اس نہیں لیے کہ کہیں کسی اہم شخصیت کا نام چھوٹ جائے تو کچھ لوگوں کو اس کا احساس ہوسکتا، اور اس کو کوتاہ نظری پر محمول کیا جاتا ہے، ہماری دعوتی تاریخ کی یہ وہ حقیقت ہے جس کو جھٹلایا نہیں جاسکتا۔

حالات چونکہ غیر معمولی انتشار وخلفشار اور ذہنی الجھنیں پیدا کرنے والے ہیں، جن سے طلبہ کی زندگی بہت زیادہ متاثر ہورہی ہے، اس لیے اس پہلو کو بھی ذہن میں رکھ کر بڑی حکمت وسوجھ بوجھ سے طلبہ کی تربیت کا کام انجام دینا ہوگا، وہ والدین کتنے خوش نصیب ہیں جو اپنے نور نظر کو اس آرزو اور تمنا کے ساتھ بھیجیں کہ ان کا جگر گوشہ انسانیت کی رہبری کا کام انجام دے، اور وہ اس مقام پر پہنچے کہ کہنے والے کو کہنا پڑے ؎

سرسبز، سبزہ ہو جو ترا پائمال ہو
ٹھہرے تو جس شجر کے تلے وہ نہال ہو

ہماری دعا ہے کہ یہ نیا سال ہمارے تمام مدارس عربیہ کے لیے نہایت مبارک ثابت ہو، طلبہ کو صحیح اسلامی ڈھانچہ میں ڈھالا جا سکے، ان کے فکر و ذہن کو اتنا بلند کیا جا سکے کہ وہ ہر طرح کی تنگ نظری اور کوتاہ بینی سے بلند ہو کر پوری انسانیت کی فلاح و نجات کے لئے فکر مند ہوں، ان کے سینوں میں پوری امت کی فکر کا درد و سوز پایا جاتا ہو، وہ تیار تو ہوں مدرسہ کے سادہ ماحول میں، مگر نظر پورے عالم کے حالات اور تقاضوں پر ہو، وہ چھوٹی چھوٹی باتوں اور جزئی و معمولی اختلافات سے بلند ہو کر عالمی سطح سے مسائل پر غور کرنے والے ہوں۔

امت مسلمہ کا اس وقت ایک بڑا سانحہ یہ ہے کہ دین وملت کے لیے طوفانی خطرات وسازشوں کے خطرناک حالات میں بھی وہ جزئی اور فروعی اختلافات کی بحثوں میں اپنی توانائی صرف کر رہی ہے۔

شافعِ روزِ جزا

کلام: مولانا فضل حق عارفؔ خیرآبادی
استاذ مدرسہ عربیہ منبع العلوم خیرآباد، مئو (یوپی)

منور کردے جو دنیائے دل، ہاں! وہ ضیا تم ہو
بصیرت بخشِ مومن، نورِ حق، شمعِ ہدیٰ تم ہو

نہیں کچھ امتیازِ ما و تو فیضانِ رحمت میں
ضیا بخشی ہے جس کی عام، وہ شمس الضحیٰ تم ہو

خدائے پاک کے فرمانِ عالی قُم فأنذِر کے
نذیرِ خوش ادا تم ہو، بشیرِ جاں فزا تم ہو

عیاں شانِ رسالت ہے کلامِ حق تعالیٰ سے
یہ رفعت اللہ اللہ محرمِ سرِّ خدا تم ہو

جہاں خائف ہیں سارے انبیا، سکتے کا عالم ہے
وہاں اعزاز تم کو، شافعِ روزِ جزا تم ہو

ملی ہے بے بہا دولت جسے اشکِ ندامت کی
تعالی اللہ عارفؔ! وہ فقیرِ بے نوا تم ہو

فتاوی

دار الافتاء جامعہ مظاہر علوم سہارنپور

س : مسجد کی آمدنی کے لیے ایک مسافر خانہ ہے جس میں سیاح آکر قیام پذیر ہوتے ہیں اس آمدنی سے مسجد کے سارے اخراجات پورے کئے جاتے ہیں تو کیا اس رقم میں سے تبلیغی جماعت والوں کے لیے گیس چولھا، برتن اور بستر وغیرہ کا انتظام کر سکتے ہیں یا نہیں؟

ج : اگر وہ مسافر خانہ مسجد کے لیے وقف ہے اور واقف نے اس کی آمدنی کو اس مسجد کے لیے خاص کیا ہے تو چونکہ واقف کی غرض اور اس کے منشاء کی رعایت کرنا شرعاً واجب ہے اس لیے اس گیسٹ ہاؤس کی آمدنی سے تبلیغی جماعت کے لیے گیس چولھا، برتن، اور بستر وغیرہ خریدنا درست نہیں ہے۔ شامی ۳ / ۴۲۳۔

ج : مسلمان عورت غیر مسلم عورت کے سامنے صرف چہرہ کھول سکتی ہے پیٹ کمر وغیرہ اس کے سامنے کھولنا درست نہیں ہے اس لیے اس سے مالش کرانا درست نہیں۔

س : بینک میں ہمارے روپئے ہیں بینک والے عید وغیرہ کے موقع پر ہمارے پاس ہدیہ بھیجتے ہیں، کیا ہم ان کے ہدیہ کو قبول کر کے استعمال کر سکتے ہیں؟

(۲) اسی طرح ہم زکوۃ میں دینے کے لیے کپڑے وغیرہ خریدتے ہیں تو دوکان والا ہمیں ان کے ضمن میں ہدیہ بھی دیتا ہے اسی طرح پنّی (پلاسٹک کی تھیلی) وغیرہ دیتا ہے کیا ہم ان ہدیہ یا پنّی (پلاسٹک کی تھیلی) وغیرہ کا استعمال کر سکتے ہیں یا نہیں؟

ج : اس بات کی تحقیق کی جائے کہ بینک سے ملنے والا یہ ہدیہ سود والی رقم سے بھیجتے ہیں یا کوئی اور شکل ہے۔ (۲) استعمال کر سکتے ہیں۔



R.N.I. REGD. NO. 62469/95U.M.

URDU MONTHLY MAGAZINE

MAZAHIR ULOOM

SAHARANPUR

MADRASA MAZAHIR ULOOM

SAHARANPUR 247001(U.P.)INDIA

PH:0132-2655542

E-Mail: jamiamazahir@gmail.com